# در امید کے دریوزہ گر

از

سمیہ مرزا

# انتساب

سچے برحق سائیں

کے نام

اس بہتی ریت کے دریا پار

کیا جانے ہیں کیا کیا اسرار

تم قا چاروں طرفوں کے

اور میرے چار طرف دیوار

# پیش رفت

غم دکھ ہر حالت میں زہر ہے، چاہے یہ دکھ اجتماعی ہو یا انفرادی۔ کسی کا رونا ایک حساس شخص کا رونا بھی بن جاتا ہے، اور حساس شخص اگر ادیب ہو، تو وہ یہ غم لفظوں کے قالب میں ڈھالتا ہے۔

جنگ اپنی یا دوسروں کی، اگر حق کی ہے تو اس کا ساتھ ضرور دیجئے۔ یہ نہ سوچیں کہ ہم نہ رہیں گے یہ سوچیں غم بھی نہ رہیں گے۔

اس کتاب کے حوالے سے میں صرف یہ کہوں گی کہ ہو سکتا ہے کہ اس میں ایک قاری کی تسکین کا سامان نہ ہو مگر نہ جانے کیوں خوش گمان سا یقین ہے کہ اسے پڑھ کر پ بھی میرے ساتھ اس جنگ میں شامل ہو جائیں گے۔ رواج، روایتیں، رسمیں اگر پھول جیسی ہوں تو ان کی ڈور تھامے کوئی نہیں تھکتا، خوشبو کا سفر محسوس ہوتا ہے مگر یہی روایتیں خنجر کی نوکوں اور ببول جیسی ہوں تو ان پر چلنے والوں کے پیر لہولہان ہو جاتے ہیں۔ روح جھلس جاتی ہے۔

اور یہ بھی سچ ہے کہ روشنی کی منزل خود چل کر کبھی نہیں تی۔ منزل کے لئے سفر کا شعور ضروری ہے کوئی روزن، در، کھولنا ضروری ہے، اک ذرا سی روشنی کی لکیر دبیز اندھیرے کا سینہ چیر دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

اور یہی شعور میں اس کہانی میں پیدا کرنے کی ادنیٰ سی کوشش کی ہے۔

معروف شاعر امجد اسلام امجد صاحب نے اس حوالے سے بڑی خوبصورت بات کہی

ہے۔

بشارتوں کا وردان کے لئے نہیں ہے جو منتظر ہیں
سکوں کی منزل خود پ چل کر قریب ئے
حصول منزل بنا سفر کے نہ ہوسکا ہے کبھی نہ ہوگا
مسافروں کے لئے سفر کا شعور لازم

درِ امید کے دریوزہ گر ماہنامہ کرن کراچی میں قسط وار شائع ہونے والا ناولٹ جس کو پہلی بار کتابی شکل میں محترم مبین خٹک صاحب شائع کر رہے ہیں۔ میں نے اپنی ہر تحریر کو پوری دیانت، محنت اور توجہ سے لکھا ہے۔ مجھے پ کے تبصروں اور تعمیری تنقید کا بڑی شدت سے (معرفت ناشر) انتظار رہے گا۔

مخلص

درِامید سیہ مرزا

# ناول کا غاز

شیشوں اور اون کے بنے جگمگ کرتے گلے اس کے سامنے رکھے تھے اس کی نکھیں تشکر سے بلقیس پر اٹھیں۔

اتنی محنت کیوں کرتی ہے تو میرے لئے بلقیس۔ اس کی نازک سفید انگلیاں بلقیس کے گندمی ہاتھوں پر جم گئیں۔ تیرے یہ ہاتھ دکھ نہیں جاتے۔

حویلی کے باغیچے کے خری گوشے میں کھجور کے درخت کے نیچے وہ یہ لمحات بلقیس کے ساتھ گزار کر مسرور ہوتی تھی۔ بلقیس ج بڑے خوبصورت گلے اور گلا پٹی اس کے لئے بنا کر لائی تھی۔

سائیڑن تم جب ایسا بولتی ہو نا تو میں خود کو کوئی بہت وڈی شے سمجھنے لگتی ہوں۔ یہ کون سا مشکل کام ہے کہ ہاتھ پیر دکھیں۔ بس تم پہن لو، تو سمجھوں میری محنت وصول ہو گئی۔

کتنی دفعہ کہا ہے سائیڑن نہ کہا کر مجھے، صرف زیمل بولا کر۔ اس نے پیار بھری سرزنش کی۔ بلقیس مسکرا دی۔

ادی زیمل میرے کہنے نہ کہنے سے فاصلے تو اتنے ہی رہیں گے نا۔

فاصلے صرف سوچ اور احساس سے جنم لیتے ہیں، نہ سوچو تو کوئی فاصلہ نہیں۔ اس بڑی

حویلی میں زیورات سے لد کر بھی میں ایک لڑکی ہی ہوں۔تمہاری جیسی، بے اختیار، بے حیثیت۔بس میرے پاس اچھے کپڑے، بہت سے زیورات اور بہت زیادہ فراغت ہے۔چھوڑ یہ بتا تو یہ سارا کام کس وقت کرتی ہے۔بچل ادا تجھے روپیہ پیسہ نہیں دیتا کیا۔

نہ سائیڑن، ادا بچل تو میرا بڑا خیال رکھتا ہے۔یہ تو بس میرا اپنا شوق ہے۔ادی زیمل اک بات پوچھوں۔

ہوں۔

پرسوں رات حویلی میں بڑا اچراغاں ہوا تھا۔

اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھنا چاہا۔زیمل نے سر اٹھایا۔

اور یہ بھی پتا ہوگا کیوں؟ اس کا چہرہ اداسی میں ڈھل گیا مگر لبوں پر نرم مسکراہٹ بدستور رہی۔بلقیس کو حوصلہ ہوا۔

مالکن کیسی ہیں؟ اس کی نکھوں اور لہجے میں بے پناہ تجسس ٹپک رہا تھا جو فطری تھا۔

حویلی میں وڈیرہ حق نواز کی تیسری بیوی نے قدم رنجہ فرمایا تھا۔کہنے کو بڑی سادگی سے عقد ہوا تھا مگر وڈیرے کی سادگی یہی تھی کہ حویلی کے طاقچوں کو دیوں سے سجایا گیا، گاؤں کے غریبوں میں دیگوں کے چاول تقسیم ہوئے، پٹاخے چھوڑے گئے تھے، ہوائی فائرنگ ہوئی تھی۔

ہاں بہت اچھی ہے، زینت تیری میری عمر سے بس چند سال ہی بڑی ہوگی۔

اس نے دھیرے سے کہا (اگر ادا مہران کی زال بن کرتی تو اچھا بھی لگتا)

ہائے رب۔ بلقیس کا ہاتھ بے اختیار سینے پر یا مگر دوسرے لمحے کھسیا کر سر ہلانے لگی۔

ستی ہوگی۔

ہوں بہت زیادہ۔ وہ جیسے کسی خیال سے چونک کر بولی۔ اس کے لبوں کی تراش میں مسکراہٹیں گھل گئیں۔ وہ بلقیس کو دیکھ رہی تھی۔

میں نے سنا ہے تیرا رشتہ یا ہوا ہے ج کل۔ یہ سوال کرتے ہوئے اس نے بلقیس کے رخساروں پر سرخی تی محسوس کی۔ وہ بیچاری اس غیر متوقع سوال پر شرما کر گلے تہہ کرنے لگی۔

بس جہاں بیری ہوتی ہے وہاں پتھر تو تے ہی ہیں نا سائیں۔ چھوریاں (لڑکیاں) بیری ہی ہوتی ہیں نا۔ یہ بہت سادہ سا جملہ تھا مگر زیمل حق نواز کے سینے کے اندر دھڑکتے جواں دل کو چھید کر گزر گیا۔

لڑکیوں بالیوں کے لئے بیری کی تشبیہ بہت پرانی تھی اور ان پر پتھر نے کی مثل بھی اس نے سن رکھی تھی مگر اسے یہ سوچ زخمی کر رہی تھی کہ۔۔۔۔۔

وہ اور ادی عابدہ بھی تو لڑکیاں ہی تھیں، بیری تھیں ان پر پتھر کیوں نہیں تے، وہ کیوں درخت سے نہیں جدا ہوتیں۔

مگر نہیں۔

ئے تو تھے، ادی عابدہ جب نوخیز تتلی جیسی رنگین ہوا کرتی تھیں۔ شباب کی کرنوں سے جگمگ جگمگ کرتی تھیں، تب بہت سے پتھر ئے تھے۔ مگر سب حویلی کی ریت رواتیوں کی

دیواروں سے ٹکرا کر پلٹ گئے، مارنے والے ہاتھ بھی تھک گئے۔ اور ادی عابدہ کی کرنیں
بھی ماند پڑ گئیں۔ تتلی کے رنگ بھی عمر کی سورج سے مرجھانے لگے اور وہ سرخ بیری ایک
کمرے کے اندر محصور ہو کر خاموش احتجاج کرتے کرتے تھک گئی۔

رواج، روایتیں، رسمیں پھولوں جیسی ہوں تو ان کی ڈور تھامے کوئی نہیں تھکتا، خوشبو کا سفر
محسوس ہوتا ہے۔ مگر یہی روایتیں خنجر کی نوکوں اور ببول کے کانٹوں جیسی ہوں تو ان پر چلنے
والے کے پیر لہولہان ہو جاتے ہیں، روح جھلس جاتی ہے۔ ستم یہ ہے کہ ان روایتوں کی سلگتی
بھٹی کو گرم رکھنے کے لئے عورت ذات ہمیشہ سے ایندھن کے طور پر استعمال ہوتی رہی ہے۔
اس کے دم سے روایتیں زندہ ہیں، اسی کے وجود سے مرد ذات کا فخر قائم ہے اور جانے کب
تک قائم رہے گا۔

ابھی تو ابا سوچ بچار کر رہے ہیں۔ بلقیس کو لطف بھی رہا تھا اس موضوع سے، اور شرم
سے کٹ بھی رہی تھی۔

اپنے گوٹھ کے ہی ہیں؟

مجھے کیا خبر۔ وہ بیر بہوٹی بن سی گئی۔ زیمل زور سے ہنس پڑی وہ بھی کھسیا کر ہنسنے لگی۔

اسے تو ادھر کو کیا کر رہی ہے؟ نچل کی واز پر بلقیس کی قل قل یوں بند ہو گئی جیسے کسی نے
ہنسی کی پھوار کے گے ہاتھ رکھ دیا ہو۔ وہ گھاس کے فرش پر سے کھڑی ہو گئی۔

ہزار دفعہ کہا ہے، بابا اپنی اوقات دیکھ، مالکن سے یوں پڑ پڑ نہ شروع ہو جایا کر، یہ تیرے

بھیجے میں کوئی بات سماتی ہی نہیں۔ جا گھر جا۔

بچل زیمل حق نواز بے تنبیہی انداز میں بچل کی طرف دیکھا اور اپنی نفیس اجرک کو شانوں پر پھیلا کر بنچ سے کھڑی ہوگئی۔ اس کا چہرہ لال ہوگیا، نکھوں میں خفگی چھلک رہی تھی۔ اسے بچل کا یہ لب ولہجہ سخت ناگوار گزرا۔

سائیڑن مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی۔ وہ جلدی سے ہاتھ جوڑ بیٹھا۔

ہاں، میں نے تمہیں پہلے بھی منع کیا تھا کہ بلقیس کو یہاں نے سے مت روکا کر، نہ مجھ سے باتیں کرنے سے، یہ میری مرضی سے یہاں تی جاتی ہے۔

ہاں ادا ج تو میں یہ گلے دینے ئی تھی۔ بلقیس کو اسے اپنی حمایت میں بولتے دیکھ کر تقویت ملی۔ اس نے سارے گلے جو ایک صاف ستھرے کپڑے میں بندھ لئے تھے، زیمل حق نواز کی طرف بڑھا دیئے۔

میں اب چلوں گی، اماں راہ دیکھ رہی ہوگی۔ وہ اس سے اجازت لے کر چلی گئی۔

وڈیری نے رخ موڑ کر بچل کو دیکھا جو مجرمانہ انداز میں ایک طرف کھڑا تھا۔

یہ میری ہم عمر ہے، ہم دونوں ایک دوسرے سے باتیں کر کے خوش ہوتے ہیں، تم نے اس بیچاری کا دل توڑ دیا۔

سائیڑن معافی چاہتا ہوں، ہم کم ہاری لوگ اور پ رئیس لوگ، کہاں مٹی کہاں سمان کا جوڑ۔ کچھ اونچ نیچ ہوگئی تو ہم غریب لوگ مارے جائیں گے۔

سچل تم بابا سائیں کے ملازم ہو، کام کرتے ہو تب بدلے میں پیشہ ملتا ہے۔ کوئی خیرات تم بھی نہیں لیتے۔

یہ پ بڑے لوگوں کی مہربانی ہے سائیڑن، کہ پ ہم کو عزت دیتے ہیں۔ پر ادی یہ بڑی اونگی بونگی ہے، اور ایک وہ چریا سجاول ہے جس نے دو چار جماعتیں پڑھ کر خود کو نجانے کیا سمجھ لیا ہے۔ میں ان دونوں سے بڑا ڈرتا ہوں، وہ سجاول تو چلو گوٹھ کم ہی تا ہے تو اچھا ہے۔

زیمل حق نواز کے قدم لمحہ بھر کو ٹھٹکے۔ دل سینے کی دیوار سے ٹکرا کر ایک نئی کیفیت سے دوچار ہوا۔

وڈیری پ ناراض تو نہیں ہونا؟

ناراض تو نہیں ہوں، پر ئندہ ایسی غلطی نہ کرنا۔ بلقیس کو یہاں نے جانے سے نہ روکنا۔ وہ پلٹ کر بولی۔ اس کا لہجہ درشت نہیں تھا، مگر مضبوط اور ن بان والا تھا۔ وہ یہ کہہ کر بڑے بڑے قدم بڑھاتی رہائشی حصے کی طرف بڑھ گئی۔



اسیں گرور را موریلا کا کر

پیٹ پراں

لیا۔

دھی یہ تو ہونا ہی تھا۔اماں کے آنسو آنکھوں سے چھلک پڑے۔

ماسی۔۔۔۔۔ماسی۔۔۔۔۔سلطان شاہ زیمل کو فرش پر لٹا کر ملازمہ کو آوازیں دینے لگا۔

پانی ڈال اس پر سلطان۔اماں اس کا سر دبانے لگیں،سلطان شاہ جلدی سے اٹھ کر میز پر سے پانی سے بھرا جگ اٹھا لایا اور اس کے منہ پر چھینٹے مارنے لگا۔

گھر کی عورتیں گھبرا کر بھاگی آئیں۔زینت ماں اس کے پیروں کے پاس بیٹھ کر اس کے تلوے سہلانے لگیں۔

کیا ہو گیا یہ بیٹھے بٹھائے۔

میری بچڑی ہوش میں آ،زیمل میری بچڑی۔اماں منہ پر دوپٹا رکھ کر رونے لگیں۔

نمی سے اس کی پلکیں لرزنے لگیں پھر آہستہ آہستہ اس نے پوری آنکھیں کھول دیں اور خالی خالی نظروں سے اپنے اوپر جھکے مہربان چہرے دیکھنے لگی۔

زیمل۔ادی عابدہ نے پیار سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے اوپر اٹھایا۔

اٹھ بیٹا۔

اماں۔۔۔۔۔۔۔اماں یہ سب کیا ہے۔وہ اچانک ہی ایک سسکاری کے ساتھ اماں کے سینے سے لگ کر دھواں دھار رونے لگی۔

سلطان۔ عابدہ، سلطان کو کمرے سے باہر جاتے دیکھ کر اس کے پیچھے لپکیں۔

ادا کیا، بات ہے، کیا ہوا ہے زیمل کو۔ سلطان نے پردہ تھام کر ذرا سا رخ

موڑا پھر ہونٹ کاٹنے لگا۔

بابا سائیں اس کا رشتہ طے کر رہے ہیں چاچا ولایت کے بیٹے سے۔

کیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اکبر سے۔ عابدہ یوں پیچھے ہٹیں جیسے سلطان نے انہیں ڈنگ ہی

مار لیا ہو۔ وہ وحشت زدہ ہو کر اسے دیکھنے لگیں۔

یہ تو ہونا ہی تھا ادی، خاندان میں اور ہے کون ہے اسے سمجھاؤ ادی اس طرح رونے اور

شور مچانے سے کچھ نہیں ہوتا، خالی خولی عزت ہی خراب ہو گی، بابا سائیں کی بات پتھر کی لکیر

ہوتی ہے۔ وہ دکھ اور کرب سے ہونٹ بھینچ کر بے بسی کے احساس کے ساتھ کمرے سے نکل

گیا۔

اندر زیمل کی سسکیاں گونج رہی تھیں وہ بین کر رہی تھی اس ظالم فیصلے کے خلاف، ادی

عابدہ کا رواں رواں بھی اس  ہ وبکا کا حصہ بن گیا۔

وہ چکراتے سر کو تھام کر اندر ئیں مگر زیمل کی حالت دیکھ کر ٹھہر نہ سکیں اور اپنے  نسو

ضبط کرتی وہاں سے نکل گئیں۔

ینے کے ٹکڑے دیکھو

ٹکڑوں میں چھپا ہے میرا من

میرے من میں عکس کسی کا

عکس بنا جو کرچیوں سے

کرچیاں جو میرے من میں چبھتی رہتی ہیں

ہر سو موت کے کالے بادل

میری راہیں تکتے ہیں

کان میں سرگوشی کرتے ہیں

تو بچ نہیں سکتی

ہاں میں بھی جانتی ہوں کہ

صدیوں سے میں ماری جاتی ہوں

مرنے کا کوئی غم نہیں

میں نہیں ڈرتی اس موت سے

جولازم اک دن تی ہے

مگر

حویلی کی دیواروں کے پیچھے گھٹ گھٹ کر

غلامی کی موت نہیں مروں گی

موت سے ٹکرا کر کہوں گی

مجھ کو مہلت دی جائے

تا کہ حویلی سے نکل کر زادی کی موت مروں

کیونکہ میں مارئی نہیں

میں بیسویں صدی کی عورت ہوں

میں زاد جینا

اور زاد مرنا چاہتی ہوں

اپنوں سے زاد

رسموں سے زاد

مجھ کو زاد مرنے دو

زیمل ،زیمل پاگل ہو جائے گی مر جائے گی یوں رو رو کر۔ادی عابدہ اسے جھنجوڑنے لگیں۔

نہیں ادی، میں اب یوں گھٹ گھٹ کر نہیں مروں گی میں اس حویلی سے نکل کر مروں گی۔اس نے گھٹنوں سے سر اٹھایا اس کی نکھیں لال ہو رہی تھیں۔مگر چہرے پر خطرناک حد تک سرد مہری چھائی ہوئی تھی، ایسی سرد مہری جو عابدہ حق نواز کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں اترتی محسوس ہوئی۔

انہوں نے پہلے قدرے چونک کر پھر قدرے تشویش کے ساتھ اسے دیکھا۔

کیا مطلب ہے تیرا۔وہ فرش پر ہی اس کے نزدیک بیٹھ گئیں۔

کس بات کا مطلب۔اس نے پتھرائی نظریں اٹھائیں۔

یہی اس بات کا جو تو سوچ رہی ہے اور بول رہی ہے، دیکھ زیمل اللہ کے واسطے ایسی کوئی بات نہ سوچنا جو حویلی کے وقار کو داغ لگا دے دیکھ تو۔۔۔۔۔۔

حویلی، یہ اونچی دیواریں، قفس ہیں، ہمارے لئے حبس بے جا میں ڈال دیا گیا ہے ہمیں، اس کا وقار۔۔۔۔۔۔۔۔اس کا وقار۔صرف ہمارے خون سے پنپ رہا ہے۔یہاں صرف عورت کے ہر اقدام سے وقار اور عزت کو تولا جاتا ہے۔

نہیں ادی نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔میں بابا سائیں کے اس اصولوں ان روایتوں اور مظالم کے گے سر نہیں جھکاؤں گی، میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ میں عابدہ حق نواز نہیں ہوں، میں زیمل ہوں، میں اس صدی کی لڑکی ہوں، زندگی جیتی جاگتی لڑکی ہوں، اپنا برا بھلا سمجھنے کا شعور رکھتی ہوں، میں بھی ان مردوں کی طرح دل رکھتی ہوں۔

خواہش پالتی ہوں۔

اللہ کے واسطے ہستہ بول۔عابدہ نے گھبرا کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

ایک دو پل وہ چپ رہی، بس چپ کی سلگتی دہکتی نظروں سے انہیں دیکھتی رہی۔

میں جانتی ہوں میری بہن، بابا سائیں کا فیصلہ تیرے دل کو چیر رہا ہے، پر دھی رانی یہاں تو ہمیشہ سے یہ ہوتا یا ہے اور ہوتا رہے گا، میں نے تجھے پہلے بھی۔۔۔۔۔۔۔

اب وہ سوچ رہی تھیں وہ اسے کیسے سمیٹیں اور کہاں سے سمیٹنا شروع کریں۔

بابا سائیں کا یہ فیصلہ سم قاتل ہی تو تھا اس کے سارے نرمل کومل خوابوں کا قتل، اس کی معصوم رزؤں کا قتل، اس نے تو ابھی کھل کر ہنسنا ہی سیکھا تھا کہ نسوؤں میں نہلانے کا حکم نامہ جاری ہو گیا تھا۔

خدایا۔انہیں خود اپنا دل جلتا محسوس ہو رہا تھا وہ اس کے تپتے دل پر کہاں سے مرہم رکھتیں وہ ہنگی سے اٹھیں اور کمرے سے نکل گئیں۔ان کے خیال میں اسے تنہا چھوڑ دینا مناسب تھا۔

وہ ڈھلتی شام تھی زیمل بڑی مشکل سے اجازت لے کر بلقیس کے یہاں ئی تھی۔اسے مہران شاہ نے خود ڈراپ کیا تھا اور اللہ رکھی کو بھی اس کے ہمراہ کر دیا تھا۔

مہران شاہ کی جیپ جونہی گے بڑھی اس نے اللہ رکھی کو دروازے پر ہی روک دیا اور خود اندر چلی ئی۔بلقیس اسے دیکھ کر دیوانہ وار بھاگی اس سے لپٹ کر بے اختیار رو دی۔

یہ۔۔۔۔۔۔۔یہ تو بڑا ظلم ہے زیمل تیرے ساتھ۔اسے بھاگل کے ذریعے ہی خبر ملی تھی کہ۔۔۔۔۔۔۔۔وڈیرہ شاہ نواز کے بیٹے اکبر سے زیمل کی بات پکی ہو رہی ہے۔گو کہ مہران شاہ نے بھاگل کو حویلی سے نکال دیا تھا مگر وہ کبھی کبھی چھپتے چھپاتے زیمل سے ملنے جایا کرتی تھی۔

بلقیس پر تو پہاڑ ہی ٹوٹ پڑا تھا وہ دہرے دکھ سے تڑپ رہی تھی۔

اب وہ سوچ رہی تھیں وہ اسے کیسے سمیٹیں اور کہاں سے سمیٹنا شروع کریں۔

بابا سائیں کا یہ فیصلہ سم قاتل ہی تو تھا اس کے سارے نرمل کومل خوابوں کا قتل، اس کی معصوم رزؤں کا قتل، اس نے تو ابھی کھل کر ہنسنا ہی سیکھا تھا کہ نسوؤں میں نہلانے کا حکم نامہ جاری ہو گیا تھا۔

خدایا۔انہیں خود اپنا دل جلتا محسوس ہو رہا تھا وہ اس کے تپتے دل پر کہاں سے مرہم رکھتیں وہ ہتگی سے اٹھیں اور کمرے سے نکل گئیں۔ان کے خیال میں اسے تنہا چھوڑ دینا مناسب تھا۔

وہ ڈھلتی شام تھی زیمل بڑی مشکل سے اجازت لے کر بلقیس کے یہاں ئی تھی۔اسے مہران شاہ نے خود ڈراپ کیا تھا اور اللہ رکھی کو بھی اس کے ہمراہ کر دیا تھا۔

مہران شاہ کی جیپ جونہی گے بڑھی اس نے اللہ رکھی کو دروازے پر ہی روک دیا اور خود اندر چلی ئی۔بلقیس اسے دیکھ کر دیوانہ وار بھاگی اس سے لپٹ کر بے اختیار رو دی۔

یہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔یہ تو بڑا ظلم ہے زیمل تیرے ساتھ۔اسے بھاگل کے ذریعے ہی خبر ملی تھی کہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔وڈیرہ شاہ نواز کے بیٹے اکبر سے زیمل کی بات پکی ہو رہی ہے۔گو کہ مہران شاہ نے بھاگل کو حویلی سے نکال دیا تھا مگر وہ کبھی کبھی چھپتے چھپاتے زیمل سے ملنے جایا کرتی تھی۔

بلقیس پر تو پہاڑ ہی ٹوٹ پڑا تھا وہ دہرے دکھ سے تڑپ رہی تھی۔

اندر۔۔۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔باہر اللہ رکھی ہے۔ زیمل اسے لئے اندرونی

کمرے میں گئی۔

تو تو راضی ہے کیا وڈیری۔ بلقیس اس کے سپاٹ چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے بے

یقینی سے پوچھ رہی تھی۔

حویلی میں صرف بابا سائیں کا حکم چلتا ہے، وہاں کسی کی رضامندی کا کوئی سوال نہیں۔ وہ

ہنس دی، مگر ایسی کھوکھلی ہنسی تھی، جیسے ایک خالی برتن میں بہت سے پتھر ڈال دئے گئے ہوں۔

بلقیس کا دل بھی رو اٹھا وہ چارپائی پر بیٹھی تو وہ خود اس کے قدموں کے نزدیک بیٹھ گئی پھر

اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بلک اٹھی۔

ایسا نہ ہونے دینا سائرن، ورنہ میرا ادا سجاول مر جائے گا وہ بڑا ضدی ہے کچھ کر بیٹھے گا۔

اور خود نقصان اٹھالے گا۔

میں اسے مرنے نہیں دوں گی بلقیس، اور نہ خود بزدلی کی یہ موت قبول کروں گی۔ اس کا

ہاتھ بلقیس کے شانے پر تھا۔ بلقیس نے سر اٹھا کر حیران نکھوں سے اسے دیکھا۔

سجاول کہاں ہے، میں اس سے ملنے ئی ہوں، حویلی میں اس سے کوئی بات کرنا مشکل

ہے۔ وہ کچھ سوچ کر اس سرد مہری اور سنجیدگی سے بولی تو بلقیس دوپٹے کے کنارے سے

نکھیں رگڑتی ہوئے کھڑی ہوگئی۔

حویلی سے ابھی یا تو تھا کسی کام سے، ٹھہرو میں دیکھتی ہوں۔ وہ کمرے سے نکل گئی کچھ

دیر بعد بچل کے ہمراہ داخل ہوئی۔

سلام سائیں۔ بچل اسے دیکھ کر ہمیشہ کی طرح ادب سے بولا۔

وہ رخ موڑے کھڑکی سے باہر اس چھوٹے سے اسکول کو دیکھ رہی تھی۔ جو گوٹھ کے ان پڑھ بچوں کے لئے شاید پہلی درسگاہ تھی۔ وہ گہری سانس لے کر پلٹی۔

اس کی نھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں اور چہرے پر عجیب سی مضمحل سنجیدگی تھی۔ وہ کچھ دیر بچل کو دیکھتی رہی پھر چلتی ہوئی اس سے ذرا فاصلے پر رک گئی۔

بچل، میں نے تمہیں پہلے بھی کبھی ملازم نہیں سمجھا تھا، مگر ج تو بھائی سمجھ کر اور بہن ہو کر کچھ کہنا چاہتی ہوں۔

سائیں۔ بچل گھبرا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

میں سمجھا نہیں پ۔

مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے بچل، ایسی مدد جو صرف تم ہی کر سکتے ہو، بولو کرو گے۔ اس کی واز بھرا گئی، ادھر بلقیس بھی دروازے پر حیران پریشان کھڑی تھی۔

حکم سائیں، ہم تو پ کے حکم کے غلام ہیں۔

نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔نہیں بچل حکم نہیں ایک التجا ہے کہ مجھے ج رات، حویلی سے نکال کر شہر لے جاؤ، میں سجاول کے پاس جانا چاہتی ہوں ان اونچی اونچی دیواروں کے قید خانے سے نکال کر لے جاؤ مجھے، دیکھو، دیکھو ادا بچل انکار نہ کرنا۔ وہ بے اختیار ہو کر بچل کے قدموں

میں جھک گئی۔

ہچل پر تو گویا ہزار پتھر لڑھک گئے اسے لگا جیسے اس کی سماعتوں پر یکے بعد دیگرے کئی دھماکے ہوئے ہوں اور یہ چھت اس پر گری ہو۔

سائیں ژن۔اس کی واز کانپ کر رہ گئی حیرت اور خوف کے ملے جلے احساسات سے اس کی قوت گویائی سلب ہوگئی۔

میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی ہچل، دیکھو رحم کرو مجھ پر ورنہ یہ لوگ۔۔۔۔۔۔۔۔۔یہ لوگ مجھے زندہ درگور کردیں گے میری روح کو ایسی تاریک قبر میں سلا دیں گے جس کے بعد میں کبھی روشنی نا پاسکوں گی، رحم کرو ہچل میں بڑی امید کے ساتھ تمہارے پاس ئی ہوں۔

سجاول کے بنا میں ادھوری ہوں، میں زندہ رہنا چاہتی ہوں ہچل، کیا اس دنیا میں مجھے خوشیاں حاصل کرنے کا حق نہیں ہے۔وہ رو رہی تھی، بلک رہی تھی۔ہچل کے پیروں پر اس کی ں ازک انگلیاں لرز رہی تھیں۔یکدم ہچل جیسے ہوش میں گیا۔وہ ہستگی سے ہٹا اور جھک کر اسے تھام کر کھڑا کردیا۔

مجھ پر رحم کرو سائژن، یوں مجھے شرمندہ تو نہ کرو، میں بڑا حقیر بندہ ہوں اور اتنی بڑی ازمائش۔اس نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے، تب بلقیس چلتی ہوئی ان دونوں کے نزدیک گئی۔زیمل کی چادر فرش سے اٹھا کر اس کے سر پر ڈال دی۔

رت ئی نہ بولاں

تو،سیڑی پھاٹ مراں

تھر کی گلوکارہ کی واز کا سوز اسے جکڑے ہوئے تھا۔وہ بیڈ پر چت لیٹی اس واز کی لے میں ڈوب اور ابھر رہی تھی کہ بھاگل نے ہستگی سے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔

روشنی کی باریک لکیر نے ن واحد میں گھپ اندھیرے کا سینہ چیر ڈالا۔اس نے گردن موڑ کر دیکھا اور پھر اٹھ بیٹھی۔

ہوں کیا بات ہے بھاگل اندر جا۔اس نے دائیں طرف جھک کر ہاتھ بڑھا کر ٹیپ ریکارڈر کا بٹن بند کر دیا۔

ستھی خبر لے کر ئی ہوں سائیڑن۔بھاگل نے اندر کر بتی جلائی۔اس کے ہاتھ میں پلیٹ تھی جس میں لڈو تھے۔

ننڈھے (چھوٹے) رئیس جی کی سگائی کی خبر لائی ہوں اور یہ لڈو بھی اسی خوشی کے ہیں۔اس نے لڈو پلیٹ سے اٹھا کر زیمل کے منہ کی طرف بڑھایا۔

کیا۔۔۔۔اداعمران شاہ کا رشتہ چاچا سائیں نے قبول کر لیا۔اس نے حیرت

اور خوشی کے ملے جلے احساس کے ساتھ بیڈ سے نیچے چھلانگ لگائی۔

ارے چری بھاگی کیا میں صرف چپ چاپ ایک لڈو کھالوں گی۔اس نے بھاگل کے ہاتھ سے لڈو اٹھا کر منہ میں رکھا۔اس کے انگ انگ سے خوشی جھلک رہی تھی۔اس نے

ادا سجاول بھی تیرا یہ احسان زندگی بھر نہ اتار سکے گا، مان جا ادا، ورنہ ورنہ، دو زندگیاں برباد ہو جائیں گی، بلکہ صدیوں تک یہی ریت چلتی رہے گی، کب تک ان ریت رسموں کا ایندھن ہم عورتیں بنتی رہیں گی، کوئی بھائی تو ایسا ہو جو بہن کے لئے گھنا سایا ہو، اس خوشیوں کا رکھوالا ہو۔ بلقیس نے زیمل کو خود سے لگا لیا۔

مجھے یقین ہے سجاول کھلے دل سے اپنے بازو وا کر دے گا تمہارے لئے۔

نچل گم صم دونوں لڑکیوں کو دیکھتا رہا۔ زیمل حق نواز کے گے اسے اپنے کندھے جھکتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

اگر وہ زیمل کی بات مان لیتا تو یہ حویلی والوں سے سراسر نمک حرامی ہوتی، اور اگر انکار کرتا تو ایک لڑکی کی، ایک جیتے جاگتے وجود کی موت ہوتی۔

جمعہ کو صرف دو روز ہی تو رہتے تھے۔ اس کی نظریں زیمل حق نواز پر اٹھیں تو وہ اندر تک سے ہل گیا۔

اس کے تصور میں سجاول گیا۔ جیسے وہ بھی التجا کر رہا ہو کہہاں ادا، میری زیمل کو مجھ سے جدا ہونے سے بچا لو، اسے زندہ درگور ہونے سے بچا لو۔

ٹھیک ہے ادی، میں پروگرام بناتا ہوں، پھر اپ سے ملنے وں گا مگر۔ وہ ہاتھ ملتے ہوئے سر اٹھا کر کچھ سوچنے لگا پھر بولا۔

تم پھر سوچ لو ادی یہ بہت بڑا قدم ہے جو تم اٹھانے جا رہی ہو، بے شک، سجاول ایک بھر

پورمرد ہے، تمہیں بہت حفاظت اور عزت سے رکھے گا مگر۔۔۔۔۔۔۔۔۔پھر زندگی بہت مشکل ہو جائے گی، ابھی تو وہ پڑھ رہا ہے، نوکری بھی پارٹ ٹائم کرتا ہے۔اور۔۔۔۔۔۔۔

مجھے دولت کے انبار نہیں چاہئیں، بچل مجھے صرف ایک پرسکون گھر عزت و تحفظ اور محبت چاہئے یوں بھی بہت سا سونا لادنے اور اچھے کپڑے پہننے کا نام امیر ہونا اور خوش ہونا نہیں ہے، اور یہ دولت۔۔۔۔۔۔۔۔۔یہ دولت ہی تو حویلی کی عورتوں کی خوشیوں میں رکاوٹ ہے، اسی وجہ سے تو ہمیں ہمارے جائز حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے، کہ دولت غیروں میں نہ جائے

۔

اسی دولت کو بچانے کے لئے ادی عابدہ کا حق بخشوا دیا گیا، مجھے اکبر سے باندھا جا رہا ہے، میں نفرت کرتی ہوں اس دولت کے انبار سے، جس نے باپ بھائیوں کی نکھوں پر پٹی باندھ دی ہے، رشتوں کو غرض میں لپیٹ کر رکھ دیا ہے۔

وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپ کر رو دی۔بلقیس اس کے لئے ٹھنڈا پانی لے ئی۔ پھر خاصی دیر اسے دلاسا دیتی رہی۔

بچل کی رضامندی نے اس کے دل کو خوشی سے ہمکنار کر دیا تھا۔

اللہ رکھی نے دروازہ بجا کر مہران شاہ کے نے کی اطلاع دی تو وہ جلدی جلدی منہ دھو کر چادر اوڑھ کر باہر گئی۔بلقیس اسے دروازے تک چھوڑنے ئی اس کا ہاتھ تھاما تو وہ یخ بستہ ہو رہا تھا۔

میرے لئے دعا کرنا بلقیس۔ اس نے خاموش نظروں سے کہا پھر چادر پیشانی تک ڈال

کر گاڑی میں جا بیٹھی۔

بلقیس تب تک کھڑی رہی جب تک گاڑی نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔ پھر اندر ئی تو

سجل چارپائی پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔

وہ چپ چاپ اپنے معمول کے کام میں لگ گئی۔

گو شب و روز

تیری یاد تیرے خواب

راستہ ہیں

پر میری جان

فقط یاد سے کب شہر بستے ہیں

کب بھلا دشت کوئی خواب سے سیراب ہوا

اس کی نکھوں کے گوشے بھیگے ہوئے تھے مگر بند نکھوں کے اندر سجاول شاہ کا تصور

دمک رہا تھا۔

میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا سجاول کہ یوں میری بے کیف زندگی میں تمہاری چاہت

کے رنگ دمک اٹھیں گے۔ میرے خالی ہاتھوں میں محبت کے گلاب دے کر تم میرا پور پور معطر کر

دو گے۔ یہ تمہاری محبت کا اعجاز ہی تو ہے۔ تمہارا مہربان وجود ہی تو ہے جس نے میرے

اندھیروں کو سمیٹ لیا ہے سجاول، میرے اندر باہر کی ساری اداسیوں کو چھپا لیا ہے۔

اس کا نازک ہاتھ سجاول کے مضبوط ہاتھ کی گرفت میں تھا۔

چاہنے سے زیادہ چاہے جانے کا احساس فخر بخشتا ہے۔

ایک شام اس کی سجاول سے ہونے والی یہ مختصر اور اتفاقیہ ملاقات تھی جو اس کے چشم تصور میں بکھر بکھر کر سمٹ رہی تھی۔ سجاول کی فسوں خیز نکھوں کا طلسم وہ ایک بار پھر اپنے پور پور میں محسوس کرنے لگی۔

اس کے ہاتھ کا لمس اپنی انگلیوں پر پھر سے محسوس ہونے لگا۔

نہیں زیمل محبت خود زمین کے سینے سے پھوٹنے والے سفید گلاب کی طرح ہے جو دل کی سرزمین کو اپنی مہک سے معطر کر دیتا ہے اجالا تو تم نے میرے اندر باہر کر دیا ہے۔

اس کی نرم واز اس کے کانوں میں یوں اتری جیسے صحراؤں میں، باد نسیم چلی ہو۔ جیسے سوکھی کھیتی پر برکھا رت کا سندیسہ لانے والی پھوار گرے۔ جیسے تھر کی زمین پر بارش کے قطرے۔

یاد رکھنا سجاول، میرے حصے کی ساری روشنیاں تمہاری ہتھیلی میں ہیں، چاہو تو تم مٹھی کھول کر مجھے منور کر دو، چاہو تو ظلمتوں میں دھکیل دو۔

یہ محبت میں تم لڑکیاں اتنی خوفزدہ وہمی اور پاگل کیوں ہو جاتی ہو۔

اس کی ہنسی بھرپور اور جاندار تھی، ساتھ اس کی نرم ہنسی بھی شامل ہو گئی۔

پاگل تو میں ہوں ہی، وہ تو تم کہتے ہی ہو۔ وہ بانس کا تنکا اٹھا کر انگلیوں پر پھیرنے لگی۔

نہ صرف پاگل ہو، بلکہ پاگل کر دینا بھی جانتی ہو، وڈیری زیمل حق نواز، مجھ غریب پر رحم کرو، کسی نے دیکھ لیا تو بے کار میں الزام دیں گے کہ میں وڈیری کو شیشے میں اتار رہا ہوں۔ اس نے یہاں وہاں دیکھتے ہوئے مصنوعی گھبراہٹ کا اظہار کیا۔

وہ دونوں نہر کی طرف قطار میں لگے درختوں کے پاس کھڑے تھے۔

سچ ہی تو کہیں گے لوگ۔ وہ اس کی والہانہ نظروں کے حصار سے شرما کر بولی اور ہنس دی۔

وہ تنے سے ٹیک لگائے سینے پر بازو لپیٹے اسے بڑی خوبصورت نظروں سے دیکھ رہا تھا پھر سنبھل کر بولا۔

جاؤ زیمل، کسی نے دیکھ لیا تو خوامخواہ باتیں بنیں گی، میں نہیں ڈرتا مگر تمہاری عزت مجھے اپنے تمام تر رزوؤں سے زیادہ عزیز ہے، کسی گندے حرف کا چھینٹا تمہارے دامن پر ے میں گوارا نہیں کروں گا۔

اس کی واز بارعب اور پر تشویش تھی۔

وہ ایک دو پل فخر اور انبساط سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر دل میں خوشگوار احساس سمیٹے پلٹ گئی۔

اچانک اس کی پلکیں کھلیں اور وال کلاک سے ٹکرائیں تو سہانا منظر نظروں سے پلک جھپکتے

ہی ہٹ گیا اور اس کی جگہ وحشت نے لے لی۔

وہ جو قدم اٹھانے جا رہی تھی وہ خوشگوار اور مسرور کن نہیں تھا بلکہ ایک ایک لمحے کے ساتھ اس کا دل دھڑک کر خوف کی دلدلی زمین میں دھنستا جا رہا تھا۔

اچانک ہی شام اسے بے حد ہولناک محسوس ہونے لگی۔ ہتھیلیوں سے پسینہ بہنے لگا ج تو وقت بھی دھیرے دھیرے سرکتا محسوس ہو رہا تھا۔

ج رات بچل اسے پروگرام بتانے والا تھا۔ اور وہ اپنی ساری ہمتیں مجتمع کر رہی تھی۔ وقت کے جلدی گزرنے کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ اور عابدہ بار بار کمرے میں کر اس کے اضطراب کو دیکھ کر چپ ہو جاتیں وہ سوچتیں اسے کیسے راضی کریں، اس سے کیسے بات کریں اماں نے انہیں کتنا مشکل کام سونپا تھا۔

زیمل۔ بال خر انہوں نے بات کرنے کی ٹھان لی۔

ہاں ادی۔ وہ وال کلاک سے نظریں ہٹا کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

تم نے بابا سائیں کے فیصلے پر کیا سوچا ہے پھر۔

وہ اس سے نظریں ملائے بغیر بات کر رہی تھیں۔ زیمل کے لبوں پر زہر خند مسکراہٹ بکھر گئی۔

بابا سائیں نے سوچنے کی گنجائش ہی کہاں رکھی ہے ادی، وہ اپنے فیصلوں کی چھری سے قتل کرتے ہیں، اور مرنے والے کی خری خواہش تک نہیں پوچھتے۔

جب ہمیشہ بابا سائیں کا حکم چلا ہے اور چلتا رہے گا، تو پھر سر جھکا لینے میں حرج ہی کیا ہے، دل کو سنبھال لے تو بھی زیمل جب یوں بھی روح کو مرنا ہے تو وہ موت کیوں نہ قبول کرلیں۔ جس میں دوسرے ہی خوش ہو جائیں۔ عابدہ کرسی پر بیٹھ گئیں۔ ان کی بڑی بڑی نکھوں میں افسردگی کا دھواں تھا اور دھوئیں کے اس پار محرومی رچی بسی تھی۔

زیمل ایک دو لمحے ان کی طرف دیکھتی رہی پھر سر جھکا لیا۔

میں اماں کو کیا جواب دوں۔ اس کی خاموشی پر عابدہ پوچھنے لگیں۔

اگر میں نفی میں جواب دوں گی، تو کیا میرا کہا مان لیا جائے گا۔ وہ تلخی سے ہنسی۔

نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔ناں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اور ہاں میں میں جواب دے نہیں سکتی، پلیز ادی مجھے اکیلا چھوڑ دو بابا سائیں جو کرنا چاہیں وہ کرلیں، اور میں، میں جو چاہوں گی وہ کروں گی۔ وہ غصے سے اپنی جگہ سے اٹھی اور اندرونی کمرے میں چلی گئی، عابدہ حق نواز، مضمحل نظروں سے ہلتے پردے کو دیکھتی رہیں۔

عشاء کی نماز کے بعد حویلی میں سناٹا چھا گیا تھا، عورتیں اپنے اپنے کمروں میں تھیں۔ وہ ادی عابدہ کو غسل خانے میں جاتا دیکھ کر کمرے سے نکل ئی اور ہولے ہولے سیڑھیاں اتر کر پچھلے کوریڈور تک ئی۔

اللہ رکھی، بھی بڑی اماں کو دودھ دے کر اپنے کوارٹر میں چلی گئی تھی۔ خری ڈیوٹی بس اس کی ہوتی تھی۔ پچھلی راہداری سنسان پڑی تھی۔ یوں بھی اس طرف گیسٹ روم ہی تھے۔ اس

وجہ سے وہاں ناجانا کم ہی ہوتا تھا دن میں بھی۔

سائرن۔ پچل کی واز بے حد ہلکی تھی مگر اس کی سماعتوں نے بخوبی سن لیا، وہ اندھیرے میں کھڑا تھا۔ مگر اس کا ہیولہ اسے نظر رہا تھا۔

ہاں، بولو پچل۔ اس نے چادر منہ پر ڈال کر جواب دیا۔

ج رات چار بجے تیار رہنا ہے، فجر کی اذان سے پہلے گوٹھ سے نکل جانا ہے شہر جانے والی بس اذان کے وقت ہی ملے گی نہیں تو سوزوکی تو مل ہی جائے گی۔

وہ دبی زبان میں پروگرام بتانے لگا پھر فوراً ہی اللہ حافظ کہہ کر پچھلی طرف سے نکل گیا۔

زیمل کچھ دیر اپنی جگہ کھڑی اپنے دل کی حالت کو سنبھالنے لگی۔ پھر وہ بے واز قدموں سے واپسی کے لئے پلٹ گئی۔ مگر اس کی نظریں ستون کی پچھلی طرف ایک سائے کو دیکھ نہ پائیں۔

کمرے میں کر وہ جھٹ سے اپنے بستر پر گر گئی عابدہ غسل سے فارغ ہو کر تولیے سے بال رگڑتی باہر نکلی تھیں۔

ارے، ج تجھے بڑی جلدی نیند رہی ہے۔ اسے سر سے پیر تک چادر میں چھپے دیکھ کر وہ ہنسیں۔ مگر وہ چپ رہی۔

سو گئی کیا؟ وہ خود ہی بڑبڑائیں پھر نائٹ بلب جلا کر، دوسری بتیاں بجھا دیں، کمرہ یکلخت اندھیرے میں ڈوب گیا۔

بلکہ مدھم روشنی تھی جس میں ادی عابدہ کرسی پر بیٹھی اپنے گیلے بال سلجھا رہی تھیں۔ یہ انکی عادت تھی، رات نہا کر وہ عشاء کی نماز پڑ تیں پھر جانے کتنی رات جائے نماز پر بیٹھی تسبیح پڑھتی رہتیں کبھی تو تسبیح کے دانے بھی نہ گرتے، اور وہ دور خلاؤں میں جانے کیا تلاش کرتی رہتیں۔

اسے تو اب بس ادی عابدہ کے سونے کا انتظار کرنا تھا۔

اس کے بعد اپنا سامان تیار کرنا تھا۔

بچل نے سیاہ چادر اوڑھے بڑی مشکل سے اس کی کھڑکی تک  کر دستک دی تھی۔ مشکل اسے اس وجہ سے ہوئی تھی کہ وہ سیڑھیوں سے نہیں بلکہ چھجوں سے اوپر تک پہنچا تھا اور پچھواڑے لان کی طرف کھلنے والی کھڑکی تک  یا تھا۔

دوسری دستک پر اس نے جھٹ کھڑکی کے پٹ کھول دیئے۔ بچل نے ٹارچ کی روشنی میں اپنا  پ نمایاں کیا۔

ٹھیک ہے چلو۔

سائیں۔ وہ ایک لحظہ کو گھبرا کر بولا اگر ایک بار اور سوچ لو تو۔

کیا سوچوں بچل، کیا اپنی موت قبول کرنے کے بارے میں۔ اس نے چادر میں خود کو چھپاتے ہوئے قطعیت سے کہا۔

میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہ بھولوں گی بچل، چلو اب جلدی کرو، ایسا کرو یہ تم اٹھا لو اور پچھواڑے میرا انتظار کرو میں  تی ہوں۔ اس نے زیورات کی گٹھری بچل کو تھما دی۔

یہ۔۔۔۔ یہ کیا ہے سائرن۔ وہ زیورات کو محسوس کر کے حیرت اور خوف کا شکار ہو گیا۔

شش۔۔۔۔۔۔۔۔ ادی اٹھ جائیں گی، تم یہ سوالات بعد میں کر لینا۔ اس نے دبی واز میں اسے ڈپٹا اور کھڑکی احتیاط سے بند کر کے، کمرے سے باہر گئی۔

سیڑھیوں پر مدھم بلب روشن تھے۔ وہ بے واز سیڑھیاں پھلانگ کر راہداری عبور کر کے پچھلی طرف کے لان میں پہنچی تو ہچل تیزی سے اس کی طرف یا۔

جلدی کرو، سائرن، بہت دیر ہو گئی ہے اذان میں بس دھا گھنٹہ ہی رہتا ہے۔

ہچل گے بڑھا پیچھے زیمل احتیاط سے بڑے بڑے قدم اٹھا کر چلنے لگی۔

بس دعا کرنا سائرن ہم خیر کے ساتھ۔۔۔۔۔۔۔۔ ہچل کا جملہ ادھورا رہ گیا۔

ٹھائیں کی واز نے دونوں کے قدموں کو جکڑ لیا۔ ایک سنسناتی گولی دونوں کے اوپر سے ہو کر سامنے بادام کے درخت کی شاخ کو توڑ گئی۔ یہ گولی اتنی غیر متوقع اور اچانک تھی کہ وہ دونوں اپنی جگہ سناٹے کا شکار ہو گئی نہ پلٹنے کا یارا تھا نہ گے بڑھنے کا۔ پھر بیک وقت دونوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا جہاں سے گولی ئی تھی۔

زیمل کے پیروں تلے زمین نکلتی چلی گئی رئیس مہران شاہ ان سے ذرا فاصلے پر کھڑا تھا۔

میں چاہتا تو یہ گولی تمہارے سینوں میں بھی اتار سکتا تھی اور اتار ہی دینا چاہیے تھی مگر۔۔۔۔۔۔۔ وہ ریوالور اپنی جیکٹ کی دائیں جیب میں ڈالتا ان دونوں کے پاس یا اور خون شام نظروں سے زیمل کو دیکھا پھر ہچل کو دیکھتے ہوئے اس کے منہ سے چادر کھینچ لی۔

مسکراتے ہوئے بیڈ کی دراز سے سو کا نوٹ نکال کر بھاگل کی پلیٹ میں رکھ دیا۔

اتنی اچھی خبر لائی ہے، موتیوں سے تیرا منہ بھر دینے کو جی چاہتا ہے، چل نیچے تو بھی۔ وہ ہنستی کھلکھلاتی اس خوش ئند خبر سے سرشار کمرے سے باہر بھاگی۔ اس کے پیچھے بھاگل لپکی۔

بڑے کمرے میں حویلی کی خواتین جمع تھیں۔ بڑی اماں ایک طرف مٹھائیوں سے بھرے تھال ملازمہ سے رکھوا رہی تھیں۔ وہ سیدھی ان کی طرف ہی ئی۔

مبارک ہو اماں۔ اس کی کھنکتی واز میں خوشی کی چھاجن بج رہی تھی۔ اماں نے اپنا چہرہ اس کی سمت موڑا اور پھر بڑی محبت سے اس کے جھکے سر پر ہاتھ پھیرا۔

خیر مبارک، اللہ ان خوشیوں کو نظر بد سے بچائے رکھے۔ یہ پہلی خوشی تھی جو حویلی کی خواتین کے چہروں سے بھی ظاہر وہ رہی تھی۔ وہ عابدہ اور زینت کے درمیاں کی خالی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اسی دم وڈیرہ حق نواز اندر داخل ہوئے ان کے ہمراہ مہران شاہ بھی تھا۔

بابا یہ مٹھائی وٹھائی ابھی تک تقسیم نہیں ہوئی؟ وہ اپنی مخصوص کرسی کی طرف بڑھتے ہوئے مٹھائیوں سے بھرے ٹوکروں کو دیکھتے ہوئے بولے۔

بس ابھی رحیم اور بھاگی کو یہ کام سونپا ہے۔ اماں نے جواب دیا۔

ادا، گوٹھ والوں کو اس خوشی میں مٹھائی ملے گی، اور ہمیں کیا ملے گا؟ زیمل اپنی جگہ سے اٹھ کر مہران شاہ کی طرف ئی جس کا چہرہ نئے جذبوں سے چمک رہا تھا۔ اس کے لب پوں پ دھیمی مسکراہٹ سے وا تھے۔

غصے سے اس کی مٹھیاں بھنی ہوئی تھیں اور نکھوں میں گویا خون اتر یا تھا۔

کتے، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تو ایسی نمک حرامی کرے گا، مالکوں کی عزت پر ہاتھ ڈالے گا۔

ایک زناٹے دار تھپڑ اس نے نچل کے پتھرائے چہرے پر دے مارا، تھپڑ اتنا اچانک اور بھرپور تھا کہ وہ لڑکھڑا کر دور جا گرا۔

رخسار پر جیسے انگارے دھک اٹھے۔ وہ زیمل کی طرف متوجہ ہوا۔

شاباش ادی۔۔۔۔۔۔ شاباش اسی دن کے لئے تو اماں نے پالا پوسا تھا کہ تو یہ صلہ دے، ہماری عزت پر بٹا لگانے چلی تھی۔ اس کا ہاتھ اٹھا مگر بابا سائیں کی واز پر فضا میں بلند ہو کر واپس نیچے گر گیا۔

بابا سائیں کمدار کے ساتھ کھڑے تھے۔ اس کے چہرے پر پتھریلی سنجیدگی رقم تھی۔

بابا سائیں ۔۔۔۔۔۔۔۔یہ۔۔۔۔۔۔۔ ج رات ۔۔۔۔۔۔۔۔ منہ کالا کرنے جا رہی تھی۔ مہران شاہ خونخوار نظریں اس کے چہرے سے ہٹائے بغیر بابا سائیں سے بولا۔

میرا دل چاہتا ہے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے چیل کوؤں کو ڈال دوں، اور اس خبیث کو تو۔۔۔ وہ زمین پر بیٹھے ہوئے نچل کی طرف بڑھا اور اسے گریبان سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔

اسے تو وہ سزا دوں، وہ سزا دوں کہ پورا گوٹھ لرز اٹھے۔

مہران پٹ سزا تو ہم ضرور دیں گے، بابا ہماری عزت پر ہاتھ ڈالنے والوں کو ہم کبھی

معاف کرنے کا سوچ بھی ں ہیں سکتے۔ کیوں کچل تو، تو بہت اچھی طرح واقف ہے ہمارے مزاج سے، کیوں بابا، جانتے ہونا، ہم معاف نہیں کیا کرتے۔ وڈیرہ حق نواز نے اپنے مخصوص رعب اور جھلساتی نظروں سے کچل کو دیکھا۔ پھر مہران شاہ کو ایک طرف کیا۔

نہیں نہیں بابا سائیں۔ زیمل اچانک ان کے قدموں میں گر گئی۔

بابا سائیں کچل بے قصور ہے وہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔وہ بے گناہ ہے اس نے تو صرف میرے

حکم پر مجھے شہر لے جانے کا بیڑہ اٹھایا تھا، اسے میں نے مجبور کیا تھا۔ یقین کریں بابا سائیں میں جھوٹ نہیں بول رہی۔ وہ گڑگڑانے لگی۔ اس وقت اسے اپنی نہیں صرف اور صرف کچل کی فکر تھی۔ وہ اب ہر قسم کی اذیت یہاں تک کہ موت تک کا بھی حوصلہ پا چکی تھی۔

لے جاؤ اسے اندر۔ بابا سائیں کی سخت بے رحم  وازگونجی۔

حویلی کی ساری بتیاں ایک ایک کر کے روشن ہونے لگیں۔ یہ وحشت میں مبتلا کر دینے والا منظر کسی کی بھی سمجھ میں نہیں  رہا تھا۔ مہران شاہ اسے بے رحمی سے کھینچنے لگا۔ وہ مذمت کرتی چیختی رہی۔

بابا سائیں۔۔۔۔۔۔۔۔کچل بے قصور ہے سزا دینی ہے تو مجھے دیجئے مجرم میں ہوں، بابا سائیں۔

راہداری میں ادی عابدہ اور اماں پاگلوں کی طرح بھاگتی ں ظر  ئیں۔

کک۔۔۔۔۔۔۔۔۔کیا ہوا، مہران خیر تو ہے پتر۔

خیر نہیں ہے اماں، تیری یہ دھی اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر بھاگ رہی تھی، ایک کمی کمین کی خاطر اس حرام زادے غریب سجاول کے پاس، ہمارے نمک حرام ملازم بچل کے ساتھ، سنبھالو اسے، میں تو اس کی چمڑی ادھیڑ دوں گا۔وہ پھنکارتا ہوا آگے بڑھا اور بالوں سے کھینچتا کمرے کے فرش پر پھینکا اور اس پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔

سلطان شاہ بھی سیڑھیاں پھلانگتا اپنے گاؤں کی ڈوریاں کستا کانپتا پہنچا اور راہداری میں لگی بھیڑ کے پاس ٹھہر گیا۔

عابدہ چیخ کر مہران شاہ کا بازو پکڑ کر اسے روک رہی تھیں۔

بس کر ادا بس کر، مر جائے گی۔

مر ہی جائے تو اچھا ہے یہ زندہ رہے گی تو ہماری عزتوں پر بٹا لگاتی رہے گی۔

سلطان شاہ نے شیر کی طرح بپھرے ہوئے مہران شاہ کو کمرے سے پکڑ کر بامشکل پیچھے گھسیٹا۔

اگر اس نے اس کمرے سے قدم بھی نکالا تو میں اس کی ٹانگیں توڑ دوں گا۔

مہران شاہ نے برا بھلا کہتے ہوئے قہر برساتی نظریں اس کے بے حال سراپے پر ڈالیں جس پر عابدہ لیٹی ہوئی تھیں۔

بند کر دے اسے اسی کمرے میں۔

ہاں ہاں پت تو جا، میں دیکھتی ہوں۔ اماں روتی بلکتی اسے تھپک کر بولیں۔ سلطان شاہ اسے پکڑ کر کمرے سے باہر لے گیا۔

ادھر چچل کے پیروں سے زمین سرک گئی تھی۔ جب وڈیرے حق نواز نے اس کے ہاتھ سے زیورات کی پوٹلی لے کر کمدار کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

کمدار۔

حاضر سائیں۔ وہ پوٹلی بغل میں دبا کر گے ہاتھ جوڑ کر کسی حکم کی تکمیل کیلئے تیار دکھائی دینے لگا۔

یہاں اس پہر جو ہوا اس کی حویلی سے باہر خبر نہیں ہونی چاہیے بابا، اور ہاں چچل کو ہم سب ہی نے زیورات کی چوری کرتے ہوئے پکڑا ہے کیا کرتے ہوئے۔

چوری کرتے ہوئے سائیں۔ کمدار جلدی سے بولا۔

اور چوری کی سزا کیا ہوتی ہیجانتے ہو نا۔

نہیں، نہیں سائیں، رحم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ جھوٹ ہے یہ زیورات سائیں، زیمل بی بی نے اپنے ساتھ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

بکواس بند کر۔ وڈیرہ حق نواز کی گرج نے اسے دہلا دیا وہ گے بڑھے اور اس کی پیشانی کے بالوں سے پکڑ کر اس کا سر اٹھایا۔

ہماری عزت پر ہاتھ ڈالنے کی سزا موت ہے مگر، میں تمہیں اس سزا سے زاد کرتا ہوں،

ہاں تمہیں چوری کے الزام میں جرگے کے حوالے کروں گا۔

سائیں۔ بچل دم بخود رہ گیا۔

کیسے وڈیرہ حق نواز نے اپنی پگڑی کو سنبھالا دیا تھا۔ اپنی رسوائی کے ڈر سے اس پر چوری کا الزام رکھ کر اپنی خواہش بھی پوری کر لی تھی یعنی سانپ بھی مر جاتا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹتی۔

وہ بڑے لوگ تھے سب کر سکتے تھے چاہتے تو ابھی اور اس وقت اسکی قبر اس باغیچے میں بنا دیتے، مگر یہ وڈیرے لوگ کام بھی پکا کرتے تھے۔

کبھی یہی بچل جی حضوری کے ساتھ ان کے تمام حکموں کی تعمیل کرتا یا تھا۔۔۔۔۔۔

مگر ج وہ خود بے بس، وہ بے اختیار گڑ گڑا رہا تھا اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔

صبح گوٹھ والوں پر یہ خبر بم کی طرح پھٹی کہ بچل حویلی میں زیورات کی چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا۔ سب کمدار ایک دوسرے کو روک روک کر پوچھ رہے تھے۔ بچل کو پولیس کی بجائے جرگے کے حوالے کیا جانا تھا وہ اگر اپنا موقف بیان کرنے، اپنی صفائی میں کہنے کے بعد خود کو بے گناہ ثابت کرنے کے لئے اس انگاروں پر چلے اور اس کے پاؤں نہ جلیں۔ جب کہ اس فیصلے کی بنیاد یہی تھی کہ انگاروں پر چلنے والے دمی کے پاؤں اگر جلیں گے تو وہ مجرم ہے بصورت دیگر وہ بے گناہ قرار دیا جائے گا۔

اور بچل اچھی طرح جانتا تھا کہ جرگے میں وڈیروں کے اپنے دمی ہی ہوتے ہیں ج تک انگاروں پر چلنے والا مجرم ہی گردانا گیا ہے۔ ننانوے فیصد لوگ مجرم ہی قرار پاتے ہیں اور

اس میں اسی فیصد لوگ مجرم ہوں یا نہ ہوں گ پر چلنے سے پہلے ہی اقرار جرم کر لیتے ہیں۔اور ان کو سزا ابھی سنائی جاتی ہے۔

بچل کو اگر چہ اس وقت چھوڑ دیا گیا تھا مگر بچنے کی کوئی راہ نہیں دی گئی تھی۔پورا گوٹھ امداد علی کے گھر امنڈ یا تھا اور اس واقعہ سے بے حال مکینوں کو سنبھالنے لگا۔

بھلا میرا پٹ چوری کر سکتا ہے۔اماں بین کر رہی تھی۔وہ ان جرگے والوں سے اچھی طرح واقف تھا۔

بلقیس گم صم تھی۔وہ تو جانے کتنے خوبصورت روپہلے خواب دیکھ چکی تھی، کتنی بار تصور میں سجاول اور زیمل کو ساتھ ساتھ ہنستے مسکراتے شہر کی سڑکوں پر ہاتھ ڈالے گھومتا دیکھ چکی تھی۔

مگر یہ کیا ہو گیا اس بات کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی اس کا بھائی، نیکی کرنے پر سزا کا حقدار ٹھہرا تھا۔

نہیں نہیں، یہ سزا زیمل کو ملے، میرے ادا کو کیوں۔وہ بچل سے لپٹ گئی۔

تو۔۔۔۔تو بول، بتا گوٹھ والوں کو کہ وڈیری خود بھاگ



بل قیس۔بچل نے ایک تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔

مجھے اتنا نیچ نہ سمجھ، میں نے نمک حرامی کی سزا پائی ہے، وہ تو نیکی تھی اس کی جزا مجھے رب کے یہاں ملے گی، مگر سوچ، سوچ بلقیس سائن کے ساتھ کیا ہوگا وہ۔۔۔

تجھے اس کی فکر ہے مگر میرا دل پھٹ جائے گا اوا ہم تجھے کیسے گ پر چلتا دیکھیں گے یہ کیسے ممکن ہے کہ گ پر چلیں اور پاؤں نہ جلیں۔ بلقیس دھواں دھار رو رہی تھی بچل چارپائی پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا بس، سپاٹ چہرہ لئے ان تمام وازوں سے بے پرواہ گونگا بہرہ بن کر بیٹھا تھا مگر اس کا ذہن سوچ رہا تھا کہ سجاول سچ ہی کہتا تھا یہ جاگیردارانہ رسمیں گوٹھ والوں کی جہالت سے قائم ہیں اب تک، اب وقت ہے لوگوں کا شعور بیدار کیا جائے، ان وڈیروں جاگیرداروں سے ٹکر لی جائے جہالت کے خلاف جہاد کیا جائے۔

ایک ظالم بادشاہ کے سامنے حق بات کہنا بھی جہاد ہے۔ اور وہ ان وڈیروں کو سب کچھ ماننے والا ج خود ان کے ظلم کی لپیٹ میں تھا۔

وہ یہ معاملہ پولیس میں بھی دے سکتے تھے مگر اس طرح حویلی کی عزت پر حرف تا، بھلا بچل زبان کیوں کر بند رکھتا۔

مجرم کو گ پر جلانے کی رسم برسوں سے چلی رہی تھی جو اس گوٹھ بلکہ معاشرے کی پسماندگی کا منہ بولتا ثبوت تھی۔

گوٹھ کے ان پڑھ جاہل اور معصوم لوگ نہیں جانتے تھے کہ جرگے کے سردار غیر جانبدار

کبھی نہیں ہے۔ جاگیردار کسی کو بھی مارنے کے لئے اسی رسم کا سہارا لیتے ئے تھے۔ اور لوگ سمجھتے، انگاروں پر چل کر پاؤں جھلسانے والا حقیقتا مجرم ہے، جو جانتے تھے سچ اور غلط کا فرق وہ بھی اپنی معاشی، سماجی مجبوریوں کے ہاتھوں چپ تھے۔

رسم کی ادائیگی دوسرے دن شام کو ہونا قرار پائی تھی۔ جرگے ولوں کی طرف سے تیاریاں جاری تھیں۔

بڑے میدان میں ایک طرف شامیانے لگا کر کرسیاں ڈالی جا رہی تھیں، جیسے شادی کا کوئی موقع ہو، شامیانے کے عین سامنے ایک دس فٹ لمبا اور تین فٹ چوڑا گڑھا کھودا گیا تھا جس میں ابھی سے لکڑیاں ڈال ڈال کر گ سلگائی جا رہی تھی تا کہ کل شام تک گڑھا انگاروں سے دہک اٹھے۔ امداد علی اور اس کی بیوی حویلی کے باغیچے میں گڑگڑا رہے تھے مالکوں سے اپنے بیٹے کی زندگی کی بھیک مانگ رہے تھے۔

کیا اتنی سی چوری معاف نہیں کی جا سکتی بخی سائیں۔ امداد علی کا بوڑھا وجود بے حال ہو رہا تھا۔ مگر مالک کے کارندے انہیں اندر جانے تک کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔

سائیں کا حکم پتھر کی لکیر ہوتا ہے امداد علی، جا بابا جا یہاں سے، جان چھوڑ ہماری۔

رحم کر سائیں، رحم کر۔ ماسی زرینہ فرش پر سر ٹکا کر بین کرنے لگی۔

ادی عابدہ نے اوپر سے یہ روح کو تھرا دینے والا منظر دیکھا پھر نظریں سامنے کھلے میدان پر پڑیں تو جھرجھری لے کر کھڑکی کا پٹ بند کر دیا۔

(یہ تو نے کیا کر دیا زیبے کیا کر دیا۔) انہوں نے آنکھوں کے اشک اپنی چادر سے رگڑ دیئے۔ اور زیمل کے سرہانے بیٹھ گئیں وہ نیند کو گولیوں کے زیر اثر تھی۔ مگر ذہنی طور پر اتنی پراگندہ تھی کہ بار بار جاگ کر چیخنے لگتی۔

سلطان شاہ مضطرب سا انداز لئے داخل ہوا، وہ ابھی میدان سے ہو کر آیا تھا جہاں آنچل کو انگاروں پر چلایا جانا تھا۔ اس کے ماتھے پر پسینہ یوں پھوٹا ہوا تھا جیسے یہ سزا آنچل کو نہیں اسے ملنے والی تھی۔

ادا کچھ کر اس کی نیند ٹوٹنے لگتی ہے تو یہ پھر پاگلوں کی طرح چیخنے لگتی ہے اسے تو خبر بھی نہیں ہے کہ آنچل کو۔۔۔۔۔۔۔۔

بس کر۔ اماں نے عابدہ کو ٹوک دیا۔ مبادا وہ غنودگی میں بھی نہ سن لے۔

کیا کروں اب، بابا سائیں اور ادا مہران کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا، اسے بس نیند کی گولی دیتے رہو۔

نہیں پیئے گی اب یہ۔ اماں دکھ سے بولیں پھر اٹھ کر سلطان شاہ کے بازو سے لگ کر سسک پڑیں۔

یہ دن بھی مجھے دیکھنا تھا میرا غم سے سینا پھٹا جا رہا ہے سلطان پت، میں اپنی اولاد کو اس حرکت کی کیا سزا دوں اس کی گچی (گردن) دبا نہیں سکتی، اسے آغوش میں سمیٹتی ہوں تو اس کا جرم سامنے آجاتا ہے، اس نے ایسا کیوں کیا اس بڑھاپے میں مجھ بڈھی کا خیال نہیں آیا اسے

سلطان شاہ اماں کو تھپکنے لگا۔

پتا نہیں وہ کتنی خطا کار ہے اور ہے بھی کہ نہیں۔ اس کی واز بے حد دھیمی تھی۔

اس نے ایک نظر سوئی ہوئی زیمل پر ڈالی پھر ہستگی سے بولا۔

اسے خبر نہ ہونے پائے، بلکہ ج سارا دن نیند میں رہے تو اچھا ہے۔

مگر کب تک ادا کب تک۔ عابدہ شدت کرب سے اٹھ کر دریچے میں جا کھڑی ہوئیں۔

یہ گ صرف دو پیروں کو نہیں کتنے دلوں کو جلائے گی، کتنی روحوں کو خاکستر کرے گی، ادا

تو بابا سائیں کو روک لے ادا، یہ ظلم نہیں دیکھا جاتا ہم سے۔

ہاں پت، خر بچل نے برسوں حویلی والوں کی خدمت کی ہے۔

میں مجبور ہوں اماں۔ سلطان شاہ نے دونوں ہاتھ پہلو میں گرا دیے، اس کے چہرے پر

بے بسی، بے اختیاری اور اضطراب رقم تھا وہ اماں کو تھپک کر کمرے سے نکل گیا۔

سجا۔۔۔۔۔ول۔۔۔۔۔۔روکو اسے روکو۔ اچانک وہ ں یند سے اٹھ کر زور سے

چلانے

لگی۔ اماں اور عابدہ لپک کر اس کے بیڈ تک ئیں۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس نے

جسم پر پڑی چادر زور سے دور پھینک دی۔ پھر اماں اور عابدہ کو وحشت زدہ نظروں سے دیکھنے

لگی۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔

اماں مجھے گ دکھائی دے رہی ہے، ہاں اماں ہر طرف گ ہے شعلے اٹھ رہے ہیں

تم بھی مٹھائی کھالو جتنا دل چاہے۔

یہ کیا بات ہوئی، کچھ جیب ویب خالی کریں، ایسے کام نہیں چلے گا ادا۔

مجھے خبر تھی تو ضرور کچھ مانگے گی، مگر پہلے وڈی ادی کا حق ہے۔ اسے دیکھ کیسی صابر ہے۔

رئیس مہران شاہ نے ازراہ مذاق اسے چھیڑا مگر جانے کیوں دل پر کھٹ سے کوئی وزنی شے لگی۔ دوسری طرف اون سلائیوں میں الجھی عابدہ حق نواز کا جھکا ہوا سر اوپر اٹھا۔

ان کے لبوں پر ایک موہوم سی مسکراہٹ کر غائب ہوگئی مگر مسکراہٹ ان کے سپاٹ چہرے پر کوئی رمق پیدا نہ کرسکی۔

چلو تو پہلے ادی کا حق دے دو پھر مجھے۔ وہ اس کے سامنے ہاتھ پھیلا کر کھڑی ہوگئی۔ عابدہ جھٹکے سے اپنی جگہ چھوڑ کر اٹھ گئیں۔

کیا کر رہی ہے زیبے، چری ہے بھلا پیسوں کا میں کیا کروں گی۔ وہ اپنی چیزیں سمیٹ کر اسے سرزنش کرتی کمرے سے باہر نکل گئیں۔

خوشیاں چھڑکتے دل کی سرزمین سے پھوٹتی ہیں۔ جذبے دل کی زندہ زمین سے ابھرتے ہیں۔ مردہ دل، بنجر زمین پر صرف ویرانی اور سناٹے کے ببول اگتے ہیں۔ جن کی چبھن صرف اس کو چھونے والا ہی نہیں بلکہ اس زمین کا سینہ بھی محسوس کرتا رہتا ہے جس کی سطح کو پھاڑ کر وہ اگتے ہیں۔

عابدہ حق نواز کے دل کی زمین بھی ایسی ہی کھردری، بنجر اور سیم زدہ ہو چلی تھی جس میں

اماں۔ وہ ان کے سینے میں منہ چھپانے لگی۔ ادی عابدہ نے جلدی سے اٹھ کر کھڑکی زور سے بند کی اور اس پر پردہ گرا دیا۔

لے یہ پانی پی لے۔ اماں نے پانی اٹھا کر اسے دیا مگر اس نے ہاتھ ہٹا کر گلاس کو پرے کر دیا۔

مجھے معاف کر دے اماں، معاف کر دے۔ وہ اچانک سسک پڑی۔ اماں نے اس خود سے چمٹا لیا۔

شامیانہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا گوٹھ والے بھی چاروں طرف جمع ہو گئے تھے، بچل کو لایا جا رہا تھا، چار افراد گڑھے کے چاروں طرف پھیرے لگا رہے تھے۔ پھر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ جرگے کے سردار گڑھے سے کچھ فاصلے پر کھڑے تھے۔

بچل کا چہرہ ان ہی انگاروں کی طرح دہک رہا تھا۔ مگر اس پر کوئی تاثر نہیں تھا بس لال پتھرائی ہوئی آنکھیں تھیں۔ اس نے تو امداد علی، اماں اور بلقیس کے رونے کی آوازوں پر بھی کان بند کر رکھے تھے۔ انہیں ایک طرف ان کے عزیز رشتہ دار سنبھال رہے تھے، اس نے بس نظریں اٹھا کر شامیانے کی پہلی رو میں کرسیوں پر تماشا دیکھنے والے وڈیرہ حق نواز اور مہران شاہ کو دیکھا۔

(یہ آگ تو تمہارا حق تھی وڈیرہ حق نواز) اس نے نفرت سے سوچا پھر کلمہ پڑھ کر انگاروں پر پیر رکھ دیے، لوگوں نے ایک ثانیے آنکھیں بند کر لیں۔

بلقیس تو وہیں غش کھا کر گر گئی تھی اسے دو عورتیں اٹھا کر لے گئیں۔

ان انگاروں پر پیر رکھتے ہی بچل کا سارا وجود ہی سلگ اٹھا۔ درد کی ٹیسیں اٹھیں جو رگ رگ کو چھیدنے لگیں۔ مگر اس نے انگاروں کا یہ سفر اپنی ہمت سے جاری رکھا۔ لوگ دم بخود رہ گئے تھے۔ کتنی سسکیاں کتنے نسو حلق میں اٹک گئے تھے۔

اسے جلدی سے دو دمیوں نے پکڑ کر ایک کرسی بٹھا دیا۔

وڈیرہ حق نواز اور رئیس مہران شاہ بڑے مطمئن انداز میں بیٹھے تھے۔ جیسے ایک مداری نے دلچسپ تماشہ ان کے سامنے پیش کیا ہو۔ ابھی وہ قابل معافی نہیں ٹھہرایا گیا تھا اس کے پیروں کو بکری کے خون میں ڈالا گیا اس کے بعد پیروں کا جائزہ لیا گیا۔ اب کوئی معجزہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ انگاروں پر چل کر بھی پیر بے داغ رہتے، وہاں بڑے بڑے بلے، ابھر ئے تھے۔ جلد پھٹ گئی تھی۔ جس کی اذیت صرف بچل ہی محسوس کر سکتا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس کے دونوں پیروں کو اس کے جسم سے جدا کر دے۔ مگر وہ ضبط کے خری مراحل سے گزرتا رہا، ہونٹ بھینچے اس اذیت کو سہتا رہا۔

اس کے بلوں کو دیکھ کر جرگے والوں نیا سے مجرم قرار دے دیا۔ اور سزا سنانے کا دن کل پر رکھا گیا۔ مجمع ہستہ ہستہ چھٹ گیا۔ بس بچل کے یار دوست اس کے گرد جمع ہو کر اسے سنبھالنے لگے جواب طاقت کھو رہا تھا۔ نیم بے ہوشی اس پر طاری ہونے لگی تھی۔ رگ رگ سے ٹیسیں اٹھ کر نا قابل برداشت ہوئی جا رہی تھیں۔

سجاول شاہ غصے سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔اس کی شریانوں میں خون ابل رہا تھا۔

سجاول جذباتی نہ بنو۔علی احمد نے اس کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھا۔تو اس

نے غصے سے جھٹک دیا۔

علی احمد میرے بھائی بچل کو انگاروں پر چلایا گیا ہے۔غلط مقدمے الزام لگا کر اپنی بیٹی کا جرم بھی اس کے سر تھوپ دیا اور سزا کے طور پر بابا سے ان کی ذاتی زمین چھین لی گئی، میرے اسکول کو گ لگا دی گئی اور یہ کہہ دیا گیا کہ رات گھاس پھونس میں گ لگ گئی، اور اب تم کہتے ہو میں جزباتی نہ بنوں، میں تو ان وڈیروں کی بوٹیاں نوچ لوں گا۔وہ نفرت اور غصے سے چیخا۔

صبح ہی فقیر محمد کا بیٹا رئیس اس کے پاس پہنچا تھا اور اسے وہاں کے تمام حالات سے باخبر کیا تھا۔

سجاول اس نوبت کا تو تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، غم و غصے سے اسکی مٹھیاں بھینچ گئی تھیں۔ کنپٹیاں یوں تنی ہوئی تھیں۔جیسے وہاں رگوں کی بجائے لوہے کے تار کا جال بچھا ہوا ہو۔اس کے چہرے پر سرخی تھی جس میں ایک تکلیف دہ رنگ تھا۔ نکھوں میں خون اترا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

میں ج ہی تمہارے ساتھ گوٹھ چلتا ہوں۔وہ ہنوز مشتعل سا کمرے میں چکرا رہا تھا۔

اس کا بھائی انگاروں کا سفر کر چکا تھا اس کا باپ اپنی زمین سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا اور وہ بے

خبر تھا اس کا دل دکھ اور غصے کے مشترکہ احساس سے سلگتی بھٹی بنا ہوا تھا۔

نہ، نہ سجاول تو گوٹھ نہ نا ابھی۔ رئیس فرش سے کھڑا ہو کر اس کے سامنے کر گڑگڑایا۔

دماغ درست ہے تمہارا، اتنا بہت کچھ ہونے کے بعد تم کہہ رہے ہو میں گوٹھ نہ جاؤں

میرے گھر میں شعلے دہک رہے ہیں اور تم کہتے ہو، میں اٹھتے دھواں کا یہ کھیل دیکھتا

رہوں، یا یہاں بیٹھا گ کے بجھنے کا اور سب کچھ راکھ ہو جانے کا انتظار کرتا رہوں۔

اس نے اشتعال میں کر رئیس کو ایک طرف دھکیل دیا۔

تم اکیلے ان جاگیرداروں کا کیا بگاڑ لو گے۔ علی احمد نے بڑی سنجیدگی سے سوال کیا۔

میں مہران شاہ کی بوٹیاں کتوں کو کھلا دوں گا کچھ نہیں تو اس کے سینے میں گولیاں اتار کر

خود کو پولیس کے حوالے کر دوں گا۔

یہ تو اس وقت ممکن ہوگا جب مہران شاہ تنہا، نہتا تمہارے سامنے ے گا۔

کیا مطلب۔ وہ علی احمد کی طرف گھوم گیا۔

مطلب یہ کہ، حویلی میں داخل ہونا کسی فلم کے ہیرو کے لئے تو سان بات ہو سکتی ہے مگر

حقیقت میں ہمارے تمہارے لئے نہیں، ہزاروں مسلح دمیوں اور خونخوار کتوں سے گزر کر ان

بڑے لوگوں کی اوطاق تک پہنچا جاتا ہے۔ ایسی حماقتیں کرو سجاول اس طرح کر کے سوائے اپنی

جان ضائع کرنے کے تم کچھ نہیں کر سکو گے۔

ہاں ہاں سجاول۔ گھبرایا ہوا رئیس سجاول کے شہری دوست کی بات کی تائید میں پر زور

انداز میں سر ہلانے لگا۔

مگر سجاول کے دل میں لگی گ ان جملوں سے نہیں بجھ سکتی تھی۔ اس کا تو ابھی اور اسی وقت گوٹھ جا کر مہران شاہ کا خون پی جانے کو دل چاہ رہا تھا۔ اس کی نکھوں کے سامنے مچل تھا۔

سجاول، چاچا امداد علی نے مجھے سختی سے تاکید کی ہے کہ تمہیں کسی حال میں بھی ابھی گوٹھ نہ نے دوں، رئیس مہران شاہ تمہارے رت (خون) کا پیاسا ہے، اصل دشمن وہ تمہیں ہی تصور کر رہا ہے۔

رئیس نے کہا تو اس کے سختی سے بھینچے ہونٹوں پر نفرت انگیز مسکراہٹ رینگ گئی۔

وہ بپھرا ہوا شیر بنا پھر رہا ہے، یقین کرو سجاول۔

میں بھی تو اس کے خون کا پیاسا ہوں۔ وہ دھاڑا۔

رحم کرو چاچا پر سجاول، انہوں نے کہا ہے سجاول سے کہنا اگر وہ گوٹھ ئے تو وہ اپنے پ کو مار ڈالے گا وہ کہتے ہیں میں ایک بیٹے کے زخموں سے چور ہو گیا ہوں دوسرے کا غم سہہ نہ پاؤں گا۔ رئیس نے بال خر چاچا امداد علی کی ساری بات من وعن سنا دی کہ سجاول کو روکنے کے لئے یہ ضروری تھا۔

اس کی باتیں سجاول کے دل میں ترازو ہو گئیں۔ وہ کرسی پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔

رئیس جھوٹ نہیں بولتا تھا اور بابا کے خوف اور کمزور اعصاب سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ اس

نے کرب کی شدت سے ہونٹ باہم بھینچ لئے، اور سر جھکا کر پیشانی پر انگلیاں پھیرنے لگا۔
مگر کب تک ہم ظلم اور بربریت کے گے ہتھیار ڈالتے رہیں گے۔ کب تک دلوں پر خوف کے پہرے ڈالے، لبوں پر قفل چڑھائے ایک بے کار، بے حیثیت شے کی طرح زندہ رہیں گے کب تک خر کب تک۔ وہ کھولتا ہوا کرسی سے کھڑا ہوا سامنے رکھی تپائی پر لات ماری اور دوسرے کمرے میں چلا گیا علی احمد اور رئیس دونوں دلگرفتہ سے سر جھکائے بیٹھے رہے۔
شام کی بس سے رئیس واپس گوٹھ جا رہا تھا سجاول نے اسے سرخ سرخ کئی نوٹ دیئے۔
یہ رکھ لو بابا، کو دے دینا، بیٹھو ادھر۔ اس نے رئیس کو اپنے قریب ہی فرش پر بٹھا دیا۔
زیمل کے ساتھ کیا رویہ ہے وڈیرے کا۔ اس نے نگاہیں فرش پر جھکائے جھکائے پوچھا۔
کون، وڈیری۔
ہوں۔
اللہ جانے حویلی کے اندر کا حال کون جان سکتا ہے سوائے رب کی ذات کے، یا خود انہی لوگوں کے۔ رئیس نے گہری سانس لی اور اپنے بیگ میں رقم ڈالنے لگا۔ وہ کچھ دیر خالی نظروں سے اس کے ہاتھوں کی حرکت دیکھتا رہا پھر اضطرابی انداز میں کھڑا ہو گیا۔
کس کس کو خبر ہے کہ زیمل گھر سے بھاگ رہی تھی۔
کسی کو نہیں، بچل نے صرف مجھے بتایا ہے اور ہاں ادی بلقیس کے علم میں بھی ہے۔ شاید

چاچا امداد علی اور ماسی تو یہی سمجھ رہے ہیں کہ بچل پر چوری کا جھوٹا الزام لگایا ہے۔ انہیں اصل وجہ نہیں معلوم، میں اب چلوں گا۔ وہ اٹھنے لگا۔

ہوں۔ سجاول نے ہنکارا ابھرا۔ کیا بچل کی حالت بہت خراب ہے۔

نہ نہ تو فکر نہ کر اس نے انگاروں پر قدم رکھتے ہی اعتراف جرم کر لیا تھا اس لئے پیر پر ایک دو ہی بلے ہے۔ یہ جھوٹ بولتے ہوئے رئیس اپنے بیگ کی زپ کو بلاوجہ درست کرنے لگا۔ چاچا کی تاکید میں ایک یہ بھی تاکید تھی کہ اسے تفصیل نہ بتائی جائے بچل کی دگرگوں حالت بھی چھپائی جائے۔

وہ گہرے رنج کے ساتھ خاموش کھڑا رئیس کو جاتا دیکھتا رہا۔ بہت کچھ کرنے کی خواہش اور کچھ نہ کر سکنے کی بے بسی اسے اندر ہی اندر کاٹنے لگی۔

تم تو میرے اندازے سے کہیں زیادہ پاگل نکلیں زیمل۔ اس نے سلگتی آنکھیں موند لیں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم میری محبت میں یہ بھی کر گزرو گی۔

اسکا دل شدت کے ساتھ ایک نظر بچل اور زیمل حق نواز کو دیکھنے کے لئے تڑپنے لگا، جن دونوں نے محض اس کی محبت میں، خود کو آگ میں جھونک دیا تھا۔

میں جانتا ہوں، بابا نے مجھ سے بہت کچھ چھپایا ہو گا علی۔ علی احمد کے ہاتھ کا لمس اپنے کندھے پر محسوس کر کے وہ دلگرفتگی سے بولا۔

بے تحاشہ ضبط کرنے کی کوشش میں اس کی پیشانی کی رگیں چٹخنے لگی تھیں۔ اس کی

نکھیں یوں جل رہی تھیں جیسے ان کے اندر انگارے ڈال دیئے گئے ہوں۔

اگر ایسا کیا بھی ہے تو صرف تمہیں کسی غلط اقدام سے باز رکھنے کے لئے، تمہاری جان اتنی ارزاں نہیں ہے سجاول، اس کی بہت سے لوگوں کو ضرورت ہے اسے جاگیرداروں کی بھینٹ چڑھانا سراسر حماقت ہوگی اور انہی کے حق میں سودمند بھی۔

میں سوچ بھی نہیں سکتا علی کہ اتنا سب کچھ ہو جائے گا زیمل نے مجھے اتنا تو بتایا تھا کہ اس کی سگائی اس کے چاچا کے نو سالہ بیٹے سے ہونے والی ہے، مگر جذباتی لڑکی اتنا بڑا اقدم اٹھا لے گی میرے گمان میں بھی نہیں تھا، پتا نہیں اس کے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔

علی احمد نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا وہ اس لمحے کسی معصوم بچے کی طرح رنجیدہ تھا۔

کوئی چھاؤں ہو، جسے چھاؤں کہنے میں

دوپہر کا گمان نہ ہو

کوئی شام ہو جسے شام کہنے میں شب کا کوئی نشان نہ ہو

کوئی وصل ہو

جسے وصل کہنے میں ہجر کا دھواں نہ ہو

کوئی لفظ ہو، جسے لکھنے پڑھنے کی چاہ میں

کبھی ایک لمحہ گراں نہ ہو

یہ کہاں ہوا ہے کہ ہم تمہیں

کبھی اپنے دل سے پکارنے کی سعی کریں

وہیں رزوو بے اماں نہ ہو

وہیں موسم غم جان نہ ہو

جذبوں کی بربادی رزوؤں کی تشنہ کامی اور شکستہ حالی کے جس دور سے وہ گزر رہی تھی اور جو اذیت قطرہ قطرہ پہنچ رہی تھی اس کا دل ہی جانتا تھا۔ اس نے گھٹنوں سے سر اٹھایا تو عابدہ کو کمرے میں موجود پایا۔

یہ کیسے سائباں ہیں ادی، جس میں چھید ہی چھید ہے کسی پناہ گاہ ہے، جس کی دیواریں ہی نہیں جہاں محبت تحفظ کے احساس کی بجائے ڈر خوف سینوں کی تہوں میں موجزن ہے۔

ادی عابدہ نے الماری میں چابی ڈالتے ہوئے بس ایک نظر اس پر ڈالی۔

مجھے اس کمرے میں مقید کر کے مہران شاہ یا بابا سائیں یہ خیال کر رہے ہیں کہ میں بھی تمہاری طرح اپنے تمام جذبوں اور احساسات کو منجمد کر دوں گی، ایک مائی کا مادھو بن جاؤں گی، تو یہ ان کی بھول ہے یہ قید مجھے اور بھی باغی کر سکتی ہے۔

بس کر زمیل بس کر اللہ کے واسطے چپ ہو جا۔ عابدہ منتشر عصاب کے ہمراہ چیخ کر بولیں۔

جتنا تو رسوا ہو چکی ہے کیا یہ بہت نہیں ہے بابا سائیں نے اگر تجھے معاف کر دیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کبھی تمہاری خواہش پوری کر دیں گے، نہیں زمے اب ادا

کا ہاتھ تیرے چہرے پر نہیں اپنی بندوق پر اٹھے گا۔ ان کا لہجہ التجائیہ ہوگا۔

کیوں رکھا ہے مجھے اس کمرے میں قید۔ وہ چلائی کیا بگاڑلوں گی میں ان لوگوں کا۔ عابدہ نے گے بڑھ کر اس کا سر اپنے سینے سے لگالیا۔

جو ہوگیا اسے بھول جا زیمے اور اب جو وہ چاہتے ہیں سمجھ تقدیر کا لکھا یہی ہے اسے ہی مان لے۔ میری ماں، اسے مان لے تو، ہم بہت کمزور ہیں خواہشوں کے حصول لئے لڑنا ہمارے بس کی بات نہیں ہماری رزوئیں ہمارے خواب خود ہمارے لئے زنداں بن جاتیہیں۔

صرف ایک تو ہی نہیں لٹے گی ہم سب برباد ہو جائیں گے۔ تجاول مر دہی زیمل، اور مرد نارسائی کا غم زیادہ عرصے نہیں پالتا۔ اس نے سر اٹھا کر بھیگی بھیگی نکھوں سے عابدہ کو دیکھا پھر ان سے الگ ہوگئی۔

ایک بات پوچھوں ادی۔ اس کا چہرہ دہک رہا تھا۔

تجل کے ساتھ کیا ہوا ہے؟ اس کا سوال بڑا غیر متوقع تھا۔ عابدہ گڑبڑا کر فرش سے اٹھنے لگیں۔ مگر زیمل نے ان کے کندھے پر اپنے ہاتھ کا دباؤ ڈال کر ان کی یہ کوشش ناکام بنادی۔

نہیں ادی، تجھے میری قسم مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ میں نے دو دن دو راتیں بے خبری میں کاٹی ہیں مجھے تو اب ہوش یا ہے جب سے میرا چین اٹھ گیا ہے، وہ بے قصور تو میری وجہ سے ادا مہران جیسے درندے کا شکار ہوا ہے بتا ادی۔ بول نا۔ وہ اسے جھنجھوڑنے لگی۔

اب کوئی خوشی کی کونپل نہیں پھوٹ سکتی تھی۔ بس سم تھی وہ وہ سب میں بیٹھ کر نبھا چکی تھیں۔ رشتوں کے تقاضے تھے جو وہ پورے کر رہی تھیں۔ وڈی اماں کی خوشی کے احساس کا پاس تھا جو ادا کر رہی تھیں۔



ادی خفا ہو گئیں تم؟ وہ رات اپنی اور اس کی مشترکہ خوابگاہ میں وسیع بیڈ پر بیٹھ کر اس کی گردن میں بازو حمائل کرتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

نہ ماں میں، کیوں تجھ سے خفا ہونے لگی۔ عابدہ نے سے خود سے لپٹا لیا۔ حویلی میں ایک زیمل ہی تھی جسے وہ ٹوٹ کر چاہتی تھیں۔ شاید اس لئے کہ۔۔۔۔۔ اس کے اور زیمل کے دکھ سانجھے تھے۔ وہ بھی بے حیثیت، بے اختیار وجی تھی اس کی طرح۔

محبت کا جذبہ ہمدردی سے گلے مل کر اور بھی شوریدہ اور مضبوط ہو جاتا ہے۔

بلقیس نے بہت خوبصورت گلے بنائے ہیں، بڑی محنتی لڑکی ہے۔ اس نے اس کے اگلے کسی سوال سے پہلے ہی حفظ ماتقدم کے طور پر موضوع کو نیا موڑ دے دیا۔

ہاں ادی وہ خود بھی بہت اچھی ہے، ایک اور بھیجے گی۔ اس نے کہا تھا، کل شام تک بھیج دے گی۔ پ کو پسند ئے؟ وہ اس سے الگ ہو کر پوچھنے لگی۔

مجھے کچھ نہیں پتا چری، بھلا میں کب اس حویلی سے باہر نکلتی ہوں، تیری طرح اس کمرے میں چکراتی پھرتی ہوں۔ وہ الماری کھول کر چیزیں ادھر ادھر کرنے لگیں۔

خدا کے واسطے مجھ پر رحم کرو، تم سب جانتی ہو ادھر دیکھو میری طرف۔ اس نے ان کا رخ اپنی جانب کر دیا۔ ادی عابدہ اس سے نظریں ملانے سے گریز کر رہی تھیں۔

وہ اسے کیسے بتا دیتیں کہ بچل اپنے پیروں سے ناکارہ ہو چکا ہے۔ اور غریب امداد علی اپنا سارا ساز و سامان بیچ کر بھی اس کا علاج کرواتا رہے تب بھی اس کے زخم شاید مندمل نہ ہو پائیں گے۔ اور صرف یہی تو نہیں ان کی زمینیں چھین لی گئی ہیں اور اب وہ یہ گوٹھ چھوڑ کر جا رہے ہیں۔

مگر وہ یہ ساری باتیں زیمل کو نہیں بتا سکتی تھیں۔

جانے وہ غم و غصے میں کیا کر بیٹھتی۔

میں کچھ نہیں جانتی، سوائے اس کے کہ وہ گوٹھ چھوڑ رہے ہیں۔ انہوں نے پلکیں اٹھا کر سنجیدگی سے کہا۔

زیمل کئی ثانیے تکلیف دہ احساس کے ساتھ اپنی جگہ کھڑی رہ گئی۔

گو۔۔۔۔۔۔۔ٹھ چھوڑ رہے ہیں۔ اس کا دل ریزہ ریزہ ہونے لگا اس وقت دروازہ کھلا اور وڈی ماں کے ہمراہ چاچی اندر داخل ہوئیں۔

ارے تو بستر سے کیوں اٹھی ہے۔ اماں اسے کھڑا دیکھ کر لپک کر اس کے پاس آئیں۔

اس نے پتھرائی ہوئی نظروں سے نے والوں کو دیکھا۔

پھر بیڈ کے کنارے ڈھے گئی۔ یہ خبر اس کے دل کو بھاری کر گئی تھی۔

(تو کیا وہ اب ساری عمر سجاول اور بلقیس کو نہیں دیکھ سے گی۔)

ماں صدقے دھی رانی لے چاچی اس کے بلائیں لینے لگیں۔

مجھے خبر ہوئی تو میں دوڑی چلی ئی اے بھابھی یہ تو بہت کمزور ہو گئی ہے کوئی علاج کروایا ہے کہ نہیں۔

نہیں میں ٹھیک ہوں اب۔ اس نے سخت بے دلی سے چاچی کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹا دیا۔ جسے انہوں نے شاید محسوس ہی نہ کیا۔

ارے کہاں رہ گئی، یہ اللہ رکھی، تھال اس کے ہاتھ میں ہے خیر سے دونوں چھوریاں (لڑکیاں) بھی نے کو مچل رہی تھیں۔ پر میں نے روک دیا میں تو خود ابھی یہ رسم نہیں کرنا چاہتی تھی بھابھی، پر زبیدہ کے ابا زور دے رہے تھے میں تو زیمل بچڑی کے صحت مند ہو جانے کا انتظار کر لیتی پر، مہران پتر کو لگتا ہے۔ بہت جلدی ہے کہہ رہا تھا چاچی کہ سگائی کے ساتھ ہی نکاح ہو جائے تو زیادہ سیٹھا ہو گا۔

لو دیکھو ذرا اتنی جلدی کی کیا ہے، کون سے ہم بھاگے جا رہے ہیں میں تو کہتی ہوں دھیرے دھیرے کام نبٹاؤں گی کیوں بچڑی عابدہ۔ چاچی اپنا لش پش کرتا دوپٹہ سر پر جما کر ہنس ہنس کر بول رہی تھیں۔

اللہ رکھی اندر داخل ہوئی جس کے ہاتھ میں بڑا سا تھال تھا جو مختلف چیزوں سے بھرا ہوا تھا۔ اسکے پیچھے رئیس مہران شاہ بھی داخل ہوا۔

بسم اللہ کرو چاچی۔ مہران شاہ ایک طرف پشت پر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور زیمل پر نظریں ڈالیں جو پتھرائی ہوئی نکھوں سے سب کو دیکھ رہی تھی پھر اس کی نظر اللہ رکھی کے ہاتھوں میں رکھے اس تھال پر جم گئیں جس میں رکھا سرخ اور سبز کامدار دوپٹہ چاچی اٹھا کر کھولنے لگیں پھر بسم اللہ کہہ کر اسے اوڑھا دیا۔

اللہ میرے اکبر کی زندگی وڈی کرے میری دھی رانی تو سج گئی کیسی پیاری لگ رہی ہے۔ وہ جگمگاتے دوپٹے کے ہالے میں دمکتا اس کا چہرہ تھوڑی سے اوپر اٹھا کر محبت پاش نظروں سے دیکھنے لگیں۔

زیمل حق نواز کے سر پر تو جیسے سمان ٹوٹا تھا۔ اس کی نظریں اماں پر اٹھیں جو اس کے چہرے کے تاثرات کو جانچ رہی تھیں۔ پھر اس نے مہران شاہ کو سلگتی نظروں سے دیکھا جو کسی فاتح کی طرح اس کاروائی کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

چاچی اب اس کی پیشانی پر ٹیلیہ (چاند کا نشان) بنا رہی تھیں پھر مٹھائی نکال کر اماں کے منہ میں ڈالی تھوڑی سی انہوں نے کھائی باقی مسکرا کر مہران شاہ کی طرف بڑھا دی۔

اور چند سو سو کے نوٹ نکال کر زیمل کے سر پر پھیر کر اللہ رکھی کو تھما دیے۔ جس کی باچھیں اتنے نوٹ پا کر کھل اٹھی تھیں۔

دھی رانی کے نصیب اللہ سئے کرے، تنذ ھن رئیس کو خوشیاں دکھائے۔ وہ دعائیں دینے لگی۔

بل بل بہت ہو گیا۔ چاچی نے ہنس کر اس کے شانے پر ہاتھ مارا تو وہ جلدی سامان سمیٹ کر باہر نکل گئی۔ اس کے ساتھ اماں اور چاچی بھی چلی گئیں۔

بابا سائیں نے تجھے بچہ سمجھ کر معاف کر دیا ہے بابا تو نادان ہے اپنے اچھے برے کو نہیں سمجھتی ابھی۔

اس نے نفرت سے تمتاتی نظریں مہران شاہ پر اٹھائیں پھر جھکا دیں اس صدمے سے اس کی قوت گویائی ہی سلب ہو چکی تھی۔

کو اسب سے اونچے کنگورے پر بیٹھنے سے بھی عقاب نہیں بن سکتا، یہ کمی کمین ہمارے اسٹینڈرڈ کے نہیں ہیں، پیر کی جوتیاں، پیروں میں ہی سیدھی لگی ہیں۔ اس نے اپنا ہاتھ اس کے جھکے سر پر پھیرنے والے انداز میں رکھا۔

ادی اسے ٹھنڈا پانی وانی پلاؤ، یہ اب ٹھنڈے دل سے سوچے گی تو، اسے ہم دشمن نہیں دوست لگیں گے۔ وہ عابدہ کو حکم دے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

زیمل۔ عابدہ جو اس تمام عرصے میں چپ سادھے کھڑی تھیں۔ مہران شاہ کے جاتے ہی اس کے پاس دو زانو ہو کر بیٹھ گئیں۔

زیمل کے لبوں کی تراش میں بڑی اعصاب شکن مسکراہٹ ابھر کر ٹوٹ گئی، اس نے

دوپٹہ سر سے نوچ کر پھینک دیا اور پیشانی سے ٹیلیہ کا نشان رگڑنے لگی۔

اگر  زادی اور افلاس؛ یک حالت اور غلامی مگر خوشحالی کی حالت میں کسی ایک کے انتخاب کے لیے کہا جاتو ہر بالغ عاقل،  ز  دی اور افلاس کی حالت کا انتخاب کرے گا، ہونہہ کس نے کہہ دیا ہے کہ دولت کے انبار پر خوشیاں ملتی ہیں کس نے کہہ دیا کہ وڈی اوراچی حویلیاں خرشی اور انبساط کی ضمانت ہیں، جیلی جتنی بھی وسیع وعریض ہو، جیل ہی کہلا گی۔

ایک چھوٹا سا جھونپڑا اس کے سامنے پھر بھی خوشی وطمانیت کا باعث ہے اس لیے کہ وہ  زادی کا منبع ہے وہ  زادی کا نام ہے۔

وہ بڑے تحمل سے یہ سارا کچھ سہہ گئی  ی۔ دل پر گزرتے عذاب کی پذیرائی بڑے تحمل سے کر گئی تھی اور اماں اور عابدہ کے لیے یہی بہت تھا کہ اس نے چاچی کے سامنے اس کی عزت رکھ لی تھی۔

عابدہ نے غسل خانے کے دروازے پر نگاہ ڈالی جہاں وہ جا کر بند ہوگئی تھی پھر ایک گہرا سانس کھینچ کر اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے۔

کچھ بھی تھا ایک بوجھ سرک گیا تھا، ایک مرحلہ حویلی کی عورتیں باعزت طریقے سے گزار چکی تھیں۔

جس طرح دوستارے

جو بظاہر پاس لگتے ہیں

مگر ان کی رفاقت میں

کروڑوں میل کی تنہائی کا دریا بھی ہوتا ہے

یہ دریا پار کیسے ہو

نہ تم ہو اس کنارے پر

نہ ہم ہیں اس کنارے پر

سو بہتر ہے ہم اپنے اپنے دائروں کے اس خلا میں گھومتے جائیں

ستاروں کی طرح اک ساتھ چمکیں دمکیں تو سہی لیکن یہ اپنے بیچ میں جو فاصلوں کا سرخ دریا ہے

اسے تسلیم ہی کر لیں

کہ اس بے پل کے دریا میں

نہ تم ہی تیر سکتے ہو، نہ ہم ہی تیر سکتے ہیں۔

وہ کھلے لان میں چلی ئی۔ ولایت چاچا کے بیٹے اکبر رئیس کے نام کا دوپٹہ اوڑھنے کے بعد اس حویلی میں گھومنے پھرنے کی اجازت تھی۔

ملگجا اندھیرا ہر سو پھیلا ہوا تھا اس نے نگاہ پورخ کی طرف کی جہاں سیاہ *بجیرو کھڑی تھی مگر اب نچل نہیں تھا جو کپڑا ہاتھ میں لیے چم چماتی اس *بجیرو کو اور بھی چمکا تا رہتا تھا۔

پتا نہیں نچل میرے گناہ کی کیا سزا پا رہا ہو گا ادا مہران نے جس طرح نچل کی طرف دیکھا

تھا اس سے تو لگتا تھا وہ اسے قتل کر دے گا۔

وہ منظر نگاہوں میں گیا تو اسے جھرجھری گئی۔ سنسناتی گولی کی واز، پھر ادا مہران شاہ کا اچانک جانا یہی لان تھا یہی حصہ اور یہی دو قدم پر دیوار تھی جسے پھلانگ کر جانا تھا۔

وہ، مگر ٹوٹی کہاں کمند۔ اس نے بڑے کرب اور بیبسی سے اس دیوار تک کا فاصلہ ناپا۔

کتنے قریب ہو میرے دل سے سجاول، مگر کتنے دور ہو۔

اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر اپنے ماتھے پر گیا۔ بھوؤں کے درمیان ٹیلیہ کا نشان اس نے رگڑ رگڑ کر مٹایا تھا، مگر نشان مٹا دینے سے یہ رشتہ تم نہیں تو ڑ سکتی تھی۔

نو سالہ رئیس اکبر جسے وہ کبھی گودوں میں اٹھا کر کئی چکر دے ڈالتی تھی۔ چاچا کے گھر جاتی تو اس سے خوب چھیڑ چھاڑ کرتی وہ ہمک کر اس کی گود میں چڑھ بیٹھتا تھا۔

اوف۔ اس کی نکھیں درد سے پھر بھرنے لگیں۔

اس سے تو بہتر تھا ادی عابدہ کی طرح اس کا حق بخشوا دیا جاتا تنہائی میں ساری تکلیف دہ سوچیں اس کے اعصاب کو بری طرح منتشر کر رہی تھیں۔

اسے لگ رہا تھا وہ پاگل ہو جائے گی کوئی اسے سجاول کی خبر نہیں دے رہا تھا۔ کوئی اسے نہیں بتا رہا تھا کہ پگل کس اذیت میں ہے۔

وہ اجرک شانے کے گرد پھیلا کر اندر چلی ئی راہداری سے گزرتے ہو خری کنارے پر اس کے قدم ٹھ گئے۔ وہاں بڑے بڑے شیشوں کی دیوار کے قریب مہران شاہ کھڑا موبائل

پر کسی سے باتیں کر رہا تھا۔

یوں تو اسے اس کی باتوں سے کوئی سروکار نہیں تھا اسے تو اب اس حویلی ہی سے کیا خود اپنے آپ سے بھی دلچسپی نہیں رہی تھی مگر جانے کیوں اس کے قدم ٹھٹھک کر رک گئے۔

ہاں ہاں بابا اس امداد علی کے چھوکرے سجاول کی بات ہی کر رہا ہوں جو شہر میں چھپا بیٹھا ہے۔ وہ ایک ہاتھ سے اپنی مونچھوں کو سہلا رہا تھا۔ وہ موٹے سے ستون کی آڑ میں ہوگئی۔

ں، اچھا تو مجھے اس کا ایڈریس بتا دو میں اسے زیادہ دن زندہ نہیں دیکھنا چاہتا، کل ہی بندے بھیجتا ہوں۔

کہاں او اچھا۔ وہ زور سے ہنسا یہ ہنسی زیمل کے دل میں تیر کی طرح پیوست ہوگئی۔

کیا پوچھتے ہو بابا بچل تو اب اپنے جھلسے ہو پیروں کو لیے پڑا ہے، دیکھنا تو میں سجاول کو بھی ایسی حالت میں چاہتا ہوں پر۔۔۔

وہ لڑکا اتنا سیدھا نہیں ٹیڑھا ہے ذرا، یہ کمی کمین پڑھ لیتے ہیں ناں بابا تو یہ خود کو مالکوں کے برابر خیال کرنے لگتے ہیں۔

اچھا سنو چھورا (لڑکے) میں اللہ وسائیو اور دینو کو بھیج رہا ہوں شہر، تم اسے سجاول کا ٹھکانہ دیتا۔ باقی کام وہ سنبھال لیں گے۔

نہ نہ فکر نہ کرو تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ ارے بابا ہم کبھی کچا کام نہیں کرتے یہ کیس ویس نہ گوٹھ میں چلتے ہیں نہ شہر میں چلنے دیتے ہیں۔

ٹھیک ہے میں ابھی آدمیوں کو تیار کروا کر روانہ کر دیتا ہوں میرا خیال ہے جو کام رات میں ہو سکتا ہے وہ دن کی روشنی میں نہیں۔

اس نے موبائل بند کیا اور پلٹا تو ایک لمحہ کو ٹھٹکا گیا۔

زیمل لال آنکھوں کے ساتھ اس سے ذرا فاصلے پر کھڑی تھی اور وہیں رکھی اس کی شوق پر ہاتھ رکھ دیا۔

کس کس بیگناہ کا خون بہاؤ گے ادا ایک اپنے طاقتور ہونے کے زعم میں، یہ زندگی بس یہیں تو ختم نہیں ہو جاگی اس کا حساب چکانا ہوتا ہے۔

مہران شاہ کی گفتگو نے اس کے اندر کی چنگاریوں کو ایک بار پھر آگ کا روپ دے دیا تھا۔

وہ سجاول کی موت کا پروگرام ترتیب دے رہا تھا اور زیمل حق نواز کے اندر ٹوٹتے حوصلے ایک بار پھر توانا ہو کر مزاحمت کو آگ بڑھے جیسے سجاول کی موت کا نہیں خود اس کی موت کا نامہ تیار ہو چکا ہو۔

حقیقت تو یہ تھی کہ وہ اب اپنے سود و زیاں سے بینیاز ہو چکی تھی، اس کے لیے اپنی موت کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ اس لمحے بھی اس کے اندر مہران شاہ کا نہ خوف تھا نہ اپنی موت کا بس اس کی سماعتوں نے جو سنا تھا، وہی حاوی تھا۔ اسے صرف اور صرف مہران شاہ سجاول کی موت کا پیامبر دکھائی دے رہا تھا۔

اس کے خوابوں کا دشمن اس کے جذبوں کا قاتل۔

اور پتا نہیں کس کس کے قتل کا حساب اس پر نکلتا تھا۔

تم یہاں کیا کر رہی ہو، ہوش میں رہو۔ رئیس مہران شاہ اپنی حیرت سمیت غصے سے اس کی جانب بڑھا۔

اگر سب کچھ سن ہی چکی ہو تو، اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے، جاؤ اپنے کمرے میں۔ اس نے اپنی رائفل ٹیبل سے اٹھانے کو ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ زیمل نے اس پر اپنے دونوں ہاتھوں کا دباؤ بڑھا دیا۔

نہیں ادا نہیں، میں تمہیں ایسا ہرگز نہیں کرنے دوں گی۔ اس کی وحشت بھری نظریں مہران شاہ پر جمی رہیں۔

میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ بچل کے ساتھ تم لوگ یہ کر گزرو گے، جبکہ وہ بیقصور تھا۔ جرم میرا تھا وہ تو مالکین کا حکم بجا لانے کا پابند تھا۔ میرے حکم کی تعمیل کی تھی اس نے تو بس تم لوگوں نے اسے اس کی تابعداری کی یہ سزا دی۔ اسے انگاروں پر چلا دیا۔ اس جھوٹی رسم کی بھینٹ چڑھا دیا، میرے خدا۔ اس کی آنکھوں میں رنج سے آنسو آ گئے۔

بکواس نہ کر زیادہ۔ مہران شاہ کے الٹے ہاتھ کا تھپڑ اس کے منہ پر پڑا وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹی۔ پھر لپک کر اس نے بندوق پکڑ لی۔

نہیں ادا، میں بیگناہ سجاول کا خون نہیں کرنے دوں گی تمہیں، اگر اسے مارنا ہے تو پہلے

ہاں پسند کیوں نہ ئیں گے، اتنی محنت سے بنائے ہیں اس نے۔ انہوں نے تکیہ اونچا کر کیا اس پر پشت ٹکالی اور بڑے بڑے چمکتے سنہری ویزے دوپٹے کے کنارے سے نکال کر ٹھیک کر کے دوپٹہ کان کے پیچھے ڈال لیا۔ پھر گوری کلائیوں میں کھنکتی درجن بھر چوڑیوں میں سے ایک چوڑی اتار کر زیمل کی طرف بڑھائی۔

یہ اسے دے دینا۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں زیمل کہ ہم بھی غریب ہوتے، زاد اپنی منشا اپنی صلاح سے زندگی گزارنے والے، ذرا ذرا سی بات پر خوش ہونے والے۔ پر کہاں، اتنے بھاری بھاری طوق ہمارے گلے میں ڈال دیئے گئے ہیں۔ ان کی انگلیاں اپنی کلائیوں میں بجتی چوڑیوں پر پھرنے لگیں۔

تم بھی ادی ایسے ہی سوچتی ہو، میرے طرح سے۔ پر سوچنے سے کیا ہوتا ہے۔ دل جلتا ہے، روح کڑھتی ہے۔ وہ ان کے ہاتھ سے چوڑی لے کر اٹھ گئی۔

ہاں تو ٹھیک کہتی ہے، روح جلی ہے بس۔ انہوں نے گھٹنے پر ٹھوڑی ٹکالی۔

میں نے بلقیس کے لئے کچھ اور چیزیں بھی نکال رکھی ہیں۔ وہ ایسے نہیں لے گی، اس کی بات پکی ہونے والی ہے اسی بہانے دے دوں گی۔

عابدہ نے موندی پلکیں کھول کر اسے دیکھا مگر بولی کچھ نہیں۔ وہ کمرے سے چلی گئی تو انہوں نے دوبارہ سابقہ انداز میں گھٹنے پر جھکا لیا اور سلگتی پلکیں موند لیں۔

قضائے دل پر اداسی بکھرتی جاتی ہے

میرے خون سے تمہارا ہاتھ رنگین ہو گا۔

اس پر جیسے دیوانگی طاری ہو گئی۔ مہران شاہ اپنی جگہ ششدر رہ گیا۔

وہ کھل کر سجاول کی حمایت کر رہی تھی۔ وہ قید میں رہنے سے بجائے ڈبنے کے اور نڈر دکھائی دے رہی تھی۔

کیا کرو گی تم، کیسے روکو گی مجھے بھلا۔ وہ مونچھوں پر ہاتھ پھیرتا دو قدم اس کی طرف بڑھتے ہوا استہزائیہ ہنسا۔

ہاں میں جانتی ہوں میں ایک بیبس لڑکی تم ظالموں کو کسی بھی اقدام سے بھلا کیسے روک سکتی ہوں۔ تم لوگ برس ہا برس سے لوگوں پر ظلم ڈھاتے ہو۔ کوئی تمہیں روکنے والا نہیں ہے گوٹھ کی بیگناہ معصوم لڑکیوں کی عصمت سے کھیلتے ہو اس لیے کہ مہران شاہ کوئی تمہارا گریبان پکڑنے والا نہیں سب تمہارے مزارعے تمہارے غلام ہیں۔ جھوٹے مقدمات میں ان معصوم لوگوں کو انگاروں جیسی رسموں کی بھینٹ چڑھا دیتے ہو۔ لوگ سچ جھوٹ کا فرق سمجھتے ہو بھی بولنے اور تمہیں روکنے سے قاصر ہیں۔

میں بھی۔ میں بھی اتنی ہی بیبس ہوں، زیادہ سے زیادہ خود کو ہی گولی مار سکتی ہوں۔ یا تمہیں۔ اس نے جھپٹ کر بندوق اٹھا لی اور دور ہٹ گئی مہران شاہ کا دل پوری قوت سے دھڑکا اور خوف کی دلدلی زمین میں دھنسنے لگا۔

اس کا چہرہ خطرناک حد تک سرخ اور سرد تھا وہ اس لمحے کچھ بھی کر سکتی تھی، خود کو یا پھر اسے

ہی گولی ماردیتی، اس کی انگلی ٹرائیگر پر ٹھہری تھی۔

پاگل ہوگئی ہو کیا یہ تم کیسی باتیں کررہی ہو۔ لاؤ بابا لاؤ یہ بندوق ادھر دو، یہ بڑا خطرناک کھلونا ہے چری۔ اس نے پچکارتے ہو اس کی جانب ہاتھ بڑھایا دوسرے لمحے بندوق پر اپنی گرفت کرلی۔

نہ ادا، میں خود کو مار سکتی ہوں نا اس جہنم سے نجات تو پا سکتی ووں۔ چھوڑ ادا میں کہہ رہی ہوں دور ہٹ جا۔ وہ چلانے لگی اور دونوں ہتھیلیوں سے بندوق پر زور لگانے لگی۔ ادھر سیڑھیوں سے اترتا سلطان شاہ اپنی جگہ حیران و پریشان رہ گیا۔

زیمل میں کہہ رہا ہوں چھوڑ دے بندوق۔ مہران شاہ نے پورا زور لگا کر بندوق کا اگلا حصہ اپنی طرف کھینچا، اور دوسرے ہاتھ سے اس کے ہاتھ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی دم دھماکا ہوا۔

اسی چھینا جھپٹی میں ٹائیگر پر دباؤ پڑا اور نال سے سنسناتی گولی نکل کر مہران شاہ کے ماتھے میں داخل ہوگئی خون کا فوارہ ابل پڑا۔ اونچا لمبا مہران شاہ پیچھے کی طرف لہرایا اور فرش پر ڈھیر ہوگیا۔

ادا۔ یہ سب اتنا نا فانا ہوا تھا کہ زیمل کے اعصاب چیخ گئے اس کے ہاتھ سے بندوق گر گئی۔ اس کے حلق سے نکلنے والی چیخ اس دھماکے سے کہیں زیادہ لرزہ خیز اور تیز تھی۔

ادا۔ مہران ادا۔ خوف اور حیرت اس کو ساکت کر گئے۔

اس کے سامنے اس کا بھائی بےحس و حرکت پڑا تھا۔ اس کے ماتھے نکلتا خون اس کے تنے ہو چہرے پر گلکاریاں کرتا جا رہا تھا۔

ادا، مہران شاہ۔ وہ دوزانو فرش پر اس کے قریب ڈھے گئی اس کی نکھیں خوف، دکھ اور وحشت سے ابلی پڑ رہی تھیں، اس کا لرزتا ہاتھ مہران شاہ کے ماتھے کی طرف بڑھا۔

زمیل۔ اپنے شانے پر سلطان شاہ کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کر کے وہ اچھل پڑی، اس کا بدن لرزنے لگا، وہ سلطان شاہ کو خوف اور دہشت بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔

زیمل اٹھ جلدی کر بھاگ جا یہاں سے۔ وہ اس کے شانے پر دباؤ ڈال کر اسے کھڑا کرنے لگا۔

سلطان یہ یہ۔ وہ اٹھتے ہولر کھڑائی، اس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ پورے بدن پر لرزہ طاری تھا۔

یہ یہ خون مم میں نے نہیں کیا سلطان، میں تو۔۔ دیکھو دیکھو ادا زندہ تو ہے نا۔

میں کہہ رہا ہوں تو پہلے یہاں سے چلی جا، جا اپنے کمرے میں، میں دیکھتا ہوں، بابا سائیں تے ہوں گے۔ وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے، جا جا زیمل۔ وہ خود بھی ادا اس ہو رہا تھا ایک طرف مہران شاہ خون میں لت پت پڑا تھا۔ دوسری طرف بابا سائیں گے جانے اور زیمل کی زندگی خطرے میں پڑ جانے کا خوف تھا۔

بھلا بابا سائیں کب یہ دیکھ سکیں گے کہ مہران شاہ کو خون میں نہلانے میں زیمل کا کتنا ہاتھ ہے وہ تو اپنے بیٹوں کی طرف بڑھتے ہاتھوں کو کاٹ دیا کرتے تھے۔اور پھر ویمل جو بیٹی تھی وہ کسی صورت میں بیٹے کے مقابلے میں اسے رعایت نہ دیتے۔

میں نے یہ خون نہیں کیا، ادا۔وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر سسکیاں دبا ہوئی بولی۔

سلطان اسے مہران شاہ کے پاس سے دھکیل کر خود جھک کر اس کی دھڑکن سننے لگا، پھر ویمل کی طرف دیکھ کر عجیب سے احساسات کے ساتھ چیخا۔

میں کہہ رہا ہوں جا تو، اپنے کمرے میں۔

وہ گھبرا کر پیچھے ہٹی مگر بابا سائیں دوسرے ملازموں کے ہمراہ تیز تیز قدموں سے راہداری مین چلے ۔وہ گولی کی وازسن کر بھاگے تھے۔

زیمل سسکیاں دباتی سیڑھیوں کی طرف بڑھ رہی تھی، بابا سائیں کو دیکھ کر اس کے جسم میں خوف کی سرد لہر اٹھی، مگر وہ رکی نہیں اور سسکیاں دباتی اوپر سیڑھیاں پھلانگ گئی۔

کچھ ہی دیر میں حویلی میں شور برپا ہو گیا سارے ملازمین یہاں سے وہاں دوڑتے چلے ۔مہران شاہ کو خون میں لت پت دیکھ کر عورتوں کی چیخیں نکل گئیں۔

یہ یہ کیا ہو گیا میرے پٹ (بیٹے) کو سلطان ۔بابا سائیں حیرت اور غم سے دنگ رہ گئے۔

ہمت کریں بابا سائیں۔سلطان نے انہیں تسلی دے کر ملازموں کے ہمراہ مہران شاہ کو اٹھا کر گاڑی میں لٹایا اور ہاسپٹل پہنچ گیا۔

پیچھے بابا سائیں بھی اپنی جیپ لے کر تیزی رفتاری سے چلے۔

اس وقت کسی کو سوال و جواب کی فرصت نہیں تھی۔غم کا ایک پہاڑ ٹوٹا تھا۔اماں تو وہیں غش کھا کر زینت کی بانہوں میں جھول گئی تھیں۔

ادھر زیمل ہانپتی کانپتی اوپر ئی اور دھپ سے دروازہ بند کر کے اس پر چٹخنی لگا دی اس کے پورے بدن پر ابھی تک ارتعاش طاری تھا،اور اعصاب پر سناٹا طاری تھا،من من بھر کے ہوتے ہو پاؤں کو بامشکل گھسیٹتی بیڈ تک ئی۔مگر بجا بیڈ پر بیٹھنے کے وہیں قریب قالین پر گئی گئی۔اسے دو قدم چلنا دوبھر ہو رہا تھا۔

اس نے گھٹنوں میں سر گرا لیا اور کب کے رکے نسو پورے زور و شور سے بہانے لگی جو کبھی گمان میں بھی نہیں تھا وہ سب ہو چکا تھا۔جس کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی وہ بس کچھ ہو گیا تھا۔

وہ ہمتگی سے اٹھی اور دروازے کی چٹخنی گرانی چاہی مگر اس کا ہاتھ لرز کر پہلو میں گر گیا۔

نہیں نہیں بابا سائیں مار ڈالیں گے۔اس کی نگاہوں میں بابا سائیں لہرانے لگے۔

وہ سیڑھیوں کی طرف لپک رہی تھی،وہ دیکھ چکے تھے،ہاں وہ مہران شاہ کو خون میں نہایا ہوا اور اسے بھاگتے ہو دیکھ چکے تھے ارادتاً نہ سہی خون تو ہو چکا تھا اس کی غلطی سے وہ بھی رئیس مہران شاہ کا بابا سائیں کے کڑیل جوان بیٹے کا۔

ہا،میرا ادا،میرا بھا،مہران شاہ خدا تجھے میری عمر بھی لگا دے یہ یہ کیا ہو گیا ایسا

کیوں ہو گیا میں نے یہ تو نہیں چاہا تھا۔

میں نے تو سجاول کے قتل سے اسے بس روکنا چاہا تھا۔ اپنے بھا کے قتل کا تو نہیں سوچا تھا۔

اچانک دروازہ باہر سے پیٹا گیا۔ وہ اچھل کر پیچھے ہوئی پھر پھٹی پھٹی نکھوں سے دروازے کو یوں دیکھنے لگی جیسے اس کے پیچھے بابا سائیں کھڑے ہوں سرخ نکھوں کے ساتھ ہاتھ میں بندوق پکڑے۔

سائںن دروازہ کھولو، سائںن غضب ہو گیا۔ واز اللہ دکھی کی تھی، اس نے خشک حلق کو تر کیا۔ پھر چادر سے منہ پونچھ کر چٹخنی گرادی۔ سائںن غضب ہو گیا وہ رئیس مہران شاہ ہے نا اسے۔۔۔اسے گولی لگ گئی ہے۔ رئیس سلطان اسے اسپتال لے کر گیا ہے۔ وہ چھوٹتے ہی بولی۔

زیمل۔ عابدہ کھلے دروازے سے بدحواس اندر داخل ہوئیں ان کا دوپٹہ ان کے پیروں میں تھا اور چہرہ نسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

زیمے ادا مہرنا اپنی بندوق صاف کر رہا تھا کہ گولی چل گئی۔ وہ سسکتی ساکت صامت زیمل کی طرف بڑھیں۔

تجھے کچھ خبر ہے نیچے فت مچی ہے ہمارا سونہڑا ادا چل بسا زیمل۔ عابدہ گے بڑھ کر اس سے لپٹنے لگیں تو وہ لہرا کر ان کے بازوؤں میں جھول گئی۔

سچل اپنی چارپائی پر لیٹا کبھی چھت کو گھورنے لگتا کبھی اماں اور ابا کو جو گھر کا ساز و سامان باندھ رہے تھے بلقیس رسوئی کا سامان پیلے بکس میں بھر رہی تھی، ساتھ ہی رو بھی رہی تھی۔

سچل کی چارپائی کے پاس سے گزری تو زور سے سسک پڑی۔

میں تو دوں گی حویلی والوں کو منہ بھر بھر کر بد دعائیں خدا ان پر قہر نازل کرے، جس طرح انہوں نے ہمارا ہنستا بستا گھر برباد کیا ہے خدا وڈیرے کا گھر بھی کرے۔

سچل نے بیبسی سے لب کاٹ کر منہ پھیر لیا۔

بلقیس اس کے پٹیوں سے بندھے پیروں کے نزدیک بیٹھ گئی۔

خدا اس وڈیری زیمل سے بھی حساب لے گا، جس نے تجھے ان حالوں کو پہنچایا ہے، اس کا کیا گیا وہ تو۔

بلقیس۔سچل نے غصے سے اسے دیکھا۔

کیوں الٹا سیدھا بولے جا رہی ہے۔

کیوں کیوں نہ بولوں ہمارا گھر برباد ہوا، ہم گوٹھ سے جا رہے ہیں، تیرے پیر بلوں سے بھرے پڑے ہیں اور میں اس وڈیری کو ان حویلی والوں کو ان ظالموں کو کچھ نہ بولوں، برسوں تیری نمک حلالی کا یہ صلہ دیا ہے ان ظالموں نے۔

تو جانتی ہے اس میں زیمل کا کوئی قصور نہیں۔پتا نہیں اس کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ہوگا، ارے چریی تجھے کیا خبر ان اچی اچی دیواروں کے اندر بہت کچھ ہو جاتا ہے، وہ مظلوم نہ

ہوتی تو بھلا کیوں بھاگتی اور پھر یہ بتا اور پھر یہ بتا کہ اس نے حکم تو نہیں یا تھا نہ مجھے، التجا کی تھی
تیری بھی تو یہی صلاح تھی بول کیا تو نے اور میں نے صرف ان کی خاطر یہ کیا تھا کہ اپنے سجاول
کے لیے۔

سچل اماں اور ابا کی موجودگی کے احساس سے دبی زبان میں بات کر رہا تھا۔ بلقیس منہ پر
چادر رکھ کر اپنی سسکیاں روک رہی تھی مگر آنکھیں تو اتر سے بہہ رہی تھیں۔

مجھے کیا خبر تھی یہ سب ہو جا گا یہ وڈیرے کسی کو ذرا بھی رعایت دینے کو تیار
نہیں ہوتے، جو تیرا جرم تھا ادا وہی بتاتے نا گوٹھ والوں کو، اور جرگے والوں کو تجھ پر
چوری کا جھوٹا لازام رکھ دیا۔

اچھا، بس کرنا۔ سچل نے اسے جھڑک دیا اماں اس طرف چلی ئیں۔

چل اٹھ یہاں سے یہ پہلے ہی پریشان ہے تو اور بھی پریشان کر رہی ہے، وہی ہوا جو
نصیب میں لکھا تھا ہم شہر جا کر اس کا علاج کرائیں گے سجاول ہے نا میرا پٹ وہاں۔ اب گوٹھ
میں رہنے کو میرا دل بھی نہیں کرتا اب تیرے ویاہ (بیاہ) کے لیے غیں گے اب،

بلقیس چارپائی سے اٹھ گئی۔

نہیں کرنا مجھے ویاہ، بس میرے ادا صاحب ئیں۔۔۔ کے پیر ٹھیک ہو جائیں اماں۔ وہ
سسکیاں دباتی وہاں سیٹ گئی۔

چری ہو گئی ہے اماں یہ تو۔ سچل زور سے ہنس پڑا۔ مگر اس کی یہ ہنسی مصنوعی اور کھوکھلی تھی کہ

جس کا خود بھی احساس کر کے وہ چپ ہو گیا پھر آنکھیں موند لیں۔

اسے کوئی امید نہیں تھی کہ اس کے پیر اب ٹھیک ہوں گے۔ وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو سکے گا۔ وہ جانتا تھا سجاول کے پاس اتنے پیسے کہاں سے آئیں گے کہ وہ اس کا علاج کرے گا، بابا کی جو زمین تھی وہ بھی جرگے والوں نے سزا کے طور پر رکھ لی تھی۔ وہ بڑے لوگ تھے سب کو ذبح کر سکتے تھے چاہتے تو اسے حویلی کے اندر ہی گولی سے اڑا دیتے۔ مگر اسے شاید یہ اذیت دے کر وہ ایک طرح سے سجاول کو بھی خبردار کرنا چاہتے تھے۔ اس کے مقاصد اور اس کے ارادوں کے سامنے خوف کا مہیب جال پھیلا دینا چاہتے تھے۔

اب تو خود اس کے دل میں بھی وڈیرے حق نواز اور رئیس مہران شاہ کے خلاف نفرت کا جذبہ امنڈ رہا تھا۔ ان کی اجارہ داری ان کے مظالم پر چیخ چیخ کر بولنے کو دل چاہ رہا تھا۔

اچانک پیروں سے ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ اس نے کراہ کر آنکھیں کھول دیں درد سے پورا بدن ٹوٹنے لگا۔ پیروں کی اینٹھن پورے بدن میں پھیلنے لگی، آنکھوں کے سامنے دھندلاہٹ کا غبار پھیل گیا۔ اس نے چہرہ موڑ کر دیکھا۔ بابا گھڑے اٹھا کر فقیر محمد کے بیٹے رئیس کی مدد سے یہ سب سوزوکی میں رکھوا رہے تھے۔

ادا۔ بلقیس اس کے پاس چلی آئی۔ اس نے چہرا پانی سے دھولیا تھا۔

تیرے سامنے زیمل کے ساتھ کیا کیا تھا وڈے رئیس نے۔

تو کیوں پوچھ رہی ہے، تو تو اسے منہ بھر بھر کر بد دعائیں دے رہی تھی۔ وہ چڑ کر بولا۔

نہیں ادا میں اس بیچاری کو کیا بددعائیں دوں گی، وہ کون سی سکھی تھی، عورت چاہے غریب کی ہو یا امیر کی ایک سا دل رکھتی ہے، ایک سے دکھ ہوتے ہیں۔ وہ تم مجھ سے بھی زیادہ بے بس اور بے اختیار تھی ادا۔

سچل نے ایک نظر اس پر ڈالی پھر چھت کو گھورنے لگا۔

میں وڈیری عابدہ کو دیکھتی ہوں، تو میرے اندر کچھ ٹوٹ جاتا ہے۔ پتا نہیں ان وڈیروں کے دل اتنے سخت کیوں ہیں ادا رحم ان کے اندر کیوں نہیں ہوتا عورت چاہے ان کے ہاری کی ہو یا ان کی اپنی، اسے بھیڑ بکری سے زیادہ نہیں سمجھتے۔

زیمل اگر حویلی میں راضی خوشی ہوتی یہ حویلی کی دیواریں یہ دولت اس کے لیے خوشی کا باعث ہوتیں تو وہ بھلا اتنا بڑا قدم کیوں اٹھاتی ہاں ادا اتنا بڑا خطرہ بھلا کیوں مول لیتی۔ وہ تو خوشیوں کی تلاش میں ادا سجاول کی طرف بڑھی تھی مگر۔۔۔

بلقیس کی آواز بھرا گئی وہ ملول ہو رہی تھی۔ اسے رہ رہ کر زیمل حق نواز کا خیال ستا رہا تھا اس سے جدائی کا رنج اس کی فکر کھا رہی تھی۔

ادا وہ بڑی خوش تھی سجاول کا یہ اسکول دیکھ کر اس نے اپنے کنگن بھی اس اسکول کے خرچے کے لیے دے دیے تھے۔

سچل نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

اچھا۔

افسردگی ہے کہ جاں تک اترتی جاتی ہے

فریب زیست سے قدرت کا مدعا معلوم

یہ ہوش ہے کہ جوانی گزرتی جاتی ہے



شام کو اس نے بھاگل کے ہاتھ سے کرتا لیتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

بلقیس ئی اور ایسے ہی چلی گئی تو نے روکا نہیں اسے۔ اس نے جھک کر سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔

نہ سائیں، بلقیس خود تو نہیں ئی وہ نیچے تو۔۔۔۔۔

ارے تو کیا ماسی سکینہ خود ئی ہیں۔ کمال کرتی ہو تم، روکو نا انہیں۔ ٹھہرو میں دیکھتی ہوں ابھی گئی نہیں ہوں گی۔ وہ سیڑھیوں سے نیچے بھاگی۔

وہ تو نہیں ئی زیمل بی بی۔ بھاگل نے سیڑھیاں اتر کر اسے پکارا مگر وہ ساری سیڑھیاں پھلانگ کر اس کی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ پوری لابی خالی تھی۔ وہ باہر کی جانب بھاگی مگر پھر ٹھ گئی۔ اس کے ہاتھوں میں بلقیس کا بھیجا ہوا جگمگ کرتا،

گرتا لرز کر رہ گیا۔ وہ پلٹ کر جا رہا تھا۔ چوڑیوں کی چھن چھن، ویزوں کے چھوٹے

ہاں ادا، وہ سجاول کی باتیں اس کے نظریات سن کر بڑی خوش ہوئی تھی اس کا بھی خواب تھا کہ گوٹھ کا ہر بچہ تعلیم حاصل کرے پر۔اس نیگہری سانس لے کر گھر کے اس حصے کی طرف نگاہ ڈالی جہاں سجاول نے ساوکل کھول رکھا تھا اور کچھ عرصہ قبل چھوٹے چھوٹے بچے بستہ اٹھا تھے الف سے اللہ کی پہچان کرائی جاتی تھی۔

سجاول کہتا تھا الف سے پڑھنا سیکھ گئے تو اہل کو سمجھنے لگو گے۔۔۔اس کی طاقت کو پہچاننے لگو گے، ان جھوٹے معبودوں اور جاگیرداروں کے بتوں کو سجدہ کرنا ان کے گے ہاتھ باندھنا چھوڑ دو گے۔

کتنی میٹھی باتیں کرتا تھا سجاول کتنے اونچے درش تھے اس کے۔وہ اس حصے میں کھڑی ہوئی۔اور جلی ہوئی دیواروں کو تکنے لگی جنہیں وڈیروں کے کارندے رات کو کر گ لگا گئے تھے اب وہاں خالی دیواریں تھیں۔

کتابیں، چٹائیاں ان معصوم بچوں کے خواب سمیت سب جل کر راکھ بن چکے تھے۔

مجھے پورونا اس بات پر تا ہے ادا کہ تیری اتنی بڑی قربانی کے بعد بھی سجاول اور زیمل ایک نہ ہو پا پتا نہیں ادا سجاول کیسے بھول پا گا، اور وہ، وہ تو دیوانی تھی ادا سجاول کی، اسے دیکھ کر ہوش بھلا دیتی تھی۔اس نے دل سے چاہا تھا سجاول کو۔

ہاں دکھ تو یہی ہے کہ اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی کچھ حاصل نہ ہو سکا۔نجل کے لہجے میں تاسف اور شکستگی کا دھواں تھا۔

بلقیس کھڑکی کے باہر پھیلے سکوت اور بڑھتی ہوئی تاریکی کو گھورنے لگی پھر چونک

کر پلٹی، چادر سے نم لود نکھیں صاف کر کے اماں کی طرف چلی ئی اور ان کے ساتھ

بکھری چیزیں سمیٹنے لگی۔ ڈھلتی رات کی دبیز تاریکی میں ہی امداد علی کا پورا گھر گوٹھ چھوڑ کر شہر کی

جانب اپنا سفر شروع کر چکا تھا۔ بلقیس چادر میں منہ چھپا نم نگاہوں سے اپنے گوٹھ کو دیکھ رہی

تھی۔ حویلی کے سامنے سے گزرتے ہو اس کی سسکاری نکل گئی۔ تلخ و شیریں بہت سی یادیں وہ

اپنے دامن میں سمیٹ کر جا رہی تھی۔

حویلی کا وہ کنج، وہ زیمل وڈیری کی شرارتیں اور مسکراہٹیں اب یاد بن کر رہ جائیں گی۔

نجل کا ہاتھ اس کے شانے پر یا تو اس نے رخ موڑ کر اسے دیکھا نجل افسردہ مسکراہٹ

سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی نم نم نکھوں کے ساتھ مسکرا دی۔

مہران شاہ کی جوان موت نے حویلی میں سناٹے طاری کر دیے تھے سوئم کے بعد وڈیرہ

حق نواز نے پہلی بار اپنے کمرے اور اوطاق سے نکل کر حویلی کا چکر لگایا۔ راہداری میں بلا مقصد

ادھر سے ادھر ٹہلتے رہے اور پھر لابی میں بیٹھ کر حقہ گڑگڑایا۔

کمدار۔

جی سوہنا سائیں۔ کمدار سرعت سے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

بابا اب ہم کسی بھی ملاقاتی سے نہیں ملیں گے۔

بہوت (بہت) بہتر سائیں، میں ابھی پریل کو پھاٹک پر منع کیے دیتا ہوں۔ کمدار حکم کی

تعمیل کے لیے باہر نکل گیا۔

بابا سائیں، پ نے مجھے بلوایا تھا۔ سلطان شاہ اپنے کرتے کی ستین کے بٹن بند کرتا ہوالابی میں یا جہاں وڈیرہ حق نواز حقہ کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ کسی سوچ میں گم تھے نظر اٹھا کر سلطان شاہ کی طرف دیکھا اور مسلسل دیکھتے رہے۔

چھ فٹ سے زیادہ لمبا قد جوڑے شانے، چہرے پر ہلکی داڑھی مونچھ وہ بیس سال میں کڑیل اور بھرپور جوان ہو چکا تھا ایک پل کو ان کی نکھیں غبار لود ہو گئیں۔ حقے کے کنارے پر ان کی انگلیاں مضبوطی سے جم گئیں۔ ایسے ہی ایک کڑیل بیٹے کو وہ کھو چکے تھے ان کی نکھوں کا نور ان کا مضبوط بازو وقت کی بیرحم دھول نے کاٹ کر رکھ دیا تھا۔

اب ان کی تمام تر امیدوں کا مرکز سلطان شاہ ہی ہو سکت اتھا۔

وہ کھڑے ہو گئے اور دونوں ہاتھ پشت پر باندھ کر اس کی طرف بڑھے۔

ہاں میں نے بلایا تھا تمہیں۔ انہوں نے سرخ سرخ نکھیں اس کے چہرے پر جما دیں۔

میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرا ایسا کڑیل گھبرو پٹ ایک چھوٹی سی گولی کا شکار بن جا گا، دیکھو ذرا یہ حیولی کیسی ویران ہو کر رہ گئی ہے۔ تم نے مہران کا کمرہ دیکھا ہے کتنا سونا اور ویران ہو گیا ہے۔ میرا سینہ کھنڈر ہو گیا اس غم میں سلطان۔

سلطان نے رنج سے باپ کو دیکھا پھر ایک ملول اور اداس سانس بھر کر رہ گیا۔

میرے اندر گ بھڑک رہی ہے، بیٹے کے کھوجانے کا غم کھا رہا ہے میرے سینے کو، وہ میرا شہزادہ تھا، اچی ن بان والا۔ میرے منہ سے نکلنے سے پہلے میرے جملوں کا مفہوم سمجھ لیا کرتا تھا۔ گوٹھ والوں پر اسکی دہشت تھی شہروں کی میٹنگوں میں وہ کیسا اونچا بولتا تھا کہ سب کو چپ لگ جاتی تھی۔ ہاری اس کے پیروں کی دھمک سے سہم جاتے تھے، حویلی اس کی بھاری واز کی ہنسی سے گونج اٹھتی تھی، ملازم کانپتے تھے اس سے۔

بابا سائیں۔ سلطان شاہ نے نرمی سے ان کی بات کاٹتے ہو کہا۔

ہم چاہیں جتنے بھی اچے ہو جائیں، مگر رہیں گے انسان، سمان کو نہیں چھو سکتے،

ہمارے پیروں کی دھمک سے جتنی بھی گونج پیدا ہو ہم رہیں گے فانی انسان بال خر اس مٹی کے اندر جائیں گے اس اوپر والے کے سامنے ہر انسان برابر ہے بابا سائیں، ہاری ہو یا بادشاہ سب کو مٹی کے ایک چھوٹے حصے میں دفن ہونا ہے۔

ہاری اور وڈیرے کو ایک صف میں کھڑے کرنے والے احمق چھورے مجھے تم سے یہی امید تھی تم میں اور مہران میں یہی تو فرق تھا بہر حال میں نے تمہیں امیری اور غریبی پر لیکچر دینے کے لئے نہیں بلایا۔ میری طرف دیکھو ایک باپ کی طرف جو اپنے بیٹے کی المناک موت پر نوحہ کناں ہے تو دوسری طرف اپنی عزت کی بکھرتی دھجیاں تنہا سمیٹتا پھر رہا ہے۔

جی، میں سمجھا نہیں بابا سائیں۔ سلطان شاہ نے استفہامیہ نظروں سے باپ کی شکل دیکھی جہاں غصہ دکھائی دے رہا تھا۔

تم نے مجھ سے غلط بیانی کی ہے سلطان۔ میر امہران شاہ اپنی رائفل صاف کرتے ہو نہیں مرا۔ اسے خود میری دھی، جسے میں دھی کہنا حرام سمجھتا ہوں زیمل نے مارا ہے اس کمی کمین سجاول کی خاطر، بولو میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ کمدار نے اپنی نکھوں سے وہ منظر دیکھا تھا۔

غلط دیکھا تھا۔ سلطان شاہ تڑپ کر چیخا، اس کا دل سینے کی دیوار میں زور و شور سے ٹکرانے لگا۔ ایک لمحے کو بابا سائیں کی سخت نظروں سے وہ سہم گیا مگر دوسرے پل وہ اعتماد سے تن کر کھڑا ہو گیا۔

غلط دیکھا ہے اس نے، بیشک وہ اپنی رائفل صاف نہیں کر رہا تھا مگر۔ وہ ذرا دیر چپ ہوا۔

تو تو پھر کیسے مرا وہ بتاؤ میں نے خود زیمل کو سیڑھیوں کی طرف بھاگتے دیکھا تھا، مہران شاہ کے پاس نے کے بجا وہ اسے خون میں لت پت دیکھ کر بھاگ
رہی تھی مجھے تو اب ہوش یا ہے میں جانتا ہوں اس حرام خور نے میرے پٹ کی جان لی ہے، اسے۔۔۔

نہیں بابا سائیں، اس نے مہران شاہ کی بندوق اٹھا کر خود کو مارنے کی کوشش کی تھی اس نے سن لیا تھا کہ ادا مہران موبائل پر سجاول کی موت کا پروگرام ترتیب دے رہا تھا یہ سن کر وہ خود کو مارنے کی دھمکی دے رہی تھی کہ ادا نے اس کے ہاتھ سے بندوق چھیننا چاہی اور بس اس چھینا جھپٹی میں گولی نکل گئی جو ادا کو لگ گئی میں سچ کہہ رہا ہوں بابا سائیں۔ اس نے ادا کو مارنے کی

قطعی کوشش نہیں کی تھی۔

وڈیرہ حق نواز کا چہرہ لال ہو گیا ان کی نکھوں میں سرخیاں اتر ئیں۔ پیشانی پر شکنوں کا جال پھیل گیا انہوں نے مٹھیاں بھینچتے ہو سامنے رکھی تپائی کو زور سے پیر کی ٹھوکر سے دور لڑھکا دیا۔

اس لڑکی کو مہران کی جگہ مر جانا چاہیے تھا، کیوں روکا مہران نے اسے، یہ رسوائی وار بدنامی کا داغ ہے ہماری پیشانیوں پر، میں نے پیدا ہوتے ہی اس کا گلا کیوں نہ گھونٹ دیا تھا، دھیان ایسی ہوتی ہیں، دیکھتے نہیں ہو عابدہ کو، کیسے لاج رکھی ہے اس نے ہماری، مگر یہ لڑکی۔۔۔ نفرت ہوگئی ہے مجھے اس کی صورت سے، میں اسے خود اپنے ہاتھوں سے ختم کردوں گا۔ وہ غصے سے اپنی جگہ سے اٹھے سلطان گھبرا کر ان کے سامنے یا۔

نہیں بابا سائیں میں پ کو ایسا نہیں کرنے دوں گا، پہلے ہی اس کی ذہنی حالت ابتر ہے وہ بلا قصور سزا سہہ رہی ہے۔

کیا تم اسے بیقصور کہہ رہے ہو۔ وڈیرہ حق نواز نے دہکتی نگاہوں سے سلطان شاہ کو گھورا اور اسے ایک طرف دھکیلنا چاہا مگر وہ چٹان کی طرح جما رہا بلکہ اس نے مضبوط بازوؤں سے باپ کے شانے تھام لیے۔

ادا کی موت یوں ہی لکھی ہوئی تھی وہ اگر پ کا پٹ تھا تو ادی بھی پ کی دھی ہے، کیا ہم نے پہلے ہی بیٹیوں کے ساتھ زیادتیاں نہیں کیں، جواب انہیں موت کے گھاٹ بھی

اتارنے لگیں۔ ان کی روحوں کو کب زندہ رکھا ہوا ہے ہم نے۔

بکواس بند کرو۔ وڈیرہ کی سانسوں میں بھونچال گیا۔ چہرے کے زاویے بگڑ گئے۔

اگر یہ لڑکی زندہ رہی، تو اور بھی رسوائیاں ہمارے مقدر میں لکھتی رہے گی، وہ ایک باغی ہے اسے ہماری عزتوں کی پروا نہیں رہی۔

گستاخی معاف بابا سائیں اسے باغی اس استحصال نے بنایا ہے، ان ریت روایتوں نے جو کانٹوں اور نشتر کی طرح ہم ان کی روحوں میں اتارتے رہے ہیں اگر ادی عابدہ چپ ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ خوش ہے وہ راضی خوش حویلی میں دن کاٹ رہی ہے، ہرگز نہیں، بلکہ وہ ایک زندہ لاش ہے جس کے تمام احساسات، جذبات کا مار دیا گیا ہو۔ جس کی روح کو قتل کر دیا گیا ہو۔

بابا سائیں حویلی کی کوئی عورت خوش نہیں ہے، بلکہ وہ تو خوشی کے اصل مفہوم سے بھی گاہ نہیں ہے، مرجانا سان ہے بابا سائیں مگر مر کر زندہ رہنا، زندہ رہ کر بار بار مرنا بہت اذیت ناک ہوتا ہے۔

پ، میں یا اس حویلی کے مرد کیا جانیں جنہیں اپنی روایتوں، اپنی دولت، اپنے اونچے شملے سے پیار ہے، کسی روایت کی پاسداری ادا میران کے لیے کیوں نہیں تھی۔ میرے لیے کیوں نہیں ہے، کیا ہماری جھوٹی عزتوں کا بار صرف عورت کو ہی اٹھانا ہے۔ ایک کمزور نحیف عورت کو۔ کیا یہ ظلم نہیں ہے، جبر و استبداد جس زمین پر قدم رکھ چکا ہو وہاں سے گزرنے والی

ہوائیں بھی بوجھل مضمحل ہوئی ہیں اس میں سانس لینے سے پھیپھڑوں میں
خوشبو روشنی نہیں اترتی بلکہ گھٹن محسوس ہوتی ہے اور حویلی میں عورتوں کے لیے ایسی ہی
گھٹن ہے اور زیمل اس گھٹن اس حبس سے گھبرا کر بھاگ رہی تھی۔

بابا سائیں اسے حق حاصل تھا زاد فضا میں سانس لینے کا ان روایتوں کی زنجیروں کو
توڑنے کا۔

وہ سرخ چہرہ لیے اپنے پورے اعتماد کے ساتھ ج پہلی بار وہ سارے پردے چاک کر رہا
تھا۔ اس در و دیواروں کی سیلن دکھا رہا تھا جس پر وڈیرہ حق نواز اور رئیس مہران شاہ نے دبدبے
رعب اور اپنے خوف کا پردہ لگا رکھا تھا مگر وہ ایک بیخوف اور کڑیل مرد تھا اسے بیاعتمادی اور گھٹن
کی ہوا میں نہیں پالا گیا تھا وہ کیوں خوفزدہ ہوتا۔

اسکی وازکی گونج سے لابی کے در و دیوار ہل رہے تھے۔ ہمیشہ کم سخن نظر نے والا سلطان
شاہ، حویلی کی اس ساری گندگی سے ج نقابیں اٹھا رہا تھا۔ جس کی بو اب اس کی برداشت سے
باہر ہو چکی تھی۔

وہ چپ ہو گیا، وڈیرہ حق نواز بھی چپ تھے۔ ان کے پاس شاید کوئی الفاظ نہیں تھے جس
سے وہ اسے جھٹلا سکتے یا شاید اس لیے کہ ان کے تمام پہلو کمزور تھے۔ یا پھر جارحانہ رویہ اختیار
کرنا یوں بھی ممکن نہ تھا کہ ان کی ساری امیدوں محبتوں کا مرکز اب صرف اور صرف سلطان شاہ
ہی رہ گیا تھا۔

وہ اپنا غصہ ضبط کرتے ہو کرسی پر ڈھے گئے اور اسکی پشت پر سر لگا کر نکھیں بند کر لیں۔ اور پیشانی پر انگلیاں رگڑنے لگے۔

بابا سائیں، میں نے کچھ غلط نہیں کہا، پ کی شان میں گستاخی نہیں کی میں تو صرف۔ وہ جھک کر ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بولا تو انہوں نے اپنی سلگتی نکھیں کھول دیں۔

تمہارے اندر بھی زیمل کی زبان بول رہی ہے۔

سلطان سیدھا ہو گیا۔ اس کے لبوں پر مجروح مسکراہٹ بکھر کر منجمد ہو گئی۔

اس کے منہ میں زبان ہی کب ہے بابا سائیں وہ تو اپنے استحصال پر بھی زبان بند رکھے ہوئے ہے۔ مگر اب ایسا نہیں ہوگا۔

کیا کرو گے تم۔ وڈیرہ حق نواز نے شعلہ بار نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

چلے جاؤ یہاں سے، دفع ہو جاؤ تم اور اس لڑکی کو جہنم واصل کر دو، اسے مار کر کسی نہر میں پھینک وّ۔

وہ میری بہن ہے بابا سائیں، کوئی بے کار شے نہیں، میں اس کا بھائی ہوں، اس کا سائبان اس کا محافظ ہوں اس کی خوشیاں ڈھونڈ کر لا کر دینے والا۔ وہ سرخ چہرہ لیے بول رہا تھا۔

پ سمجھ لیں وہ مر گئی ہے پ کے لئے میں اسے اس حویلی سے دور چھوڑ وّں گا۔ وہ پلٹ کر لابی کے داخلی دروازے کی طرف بڑھا۔

سلطان۔ حق نواز کی گرج سے درو دیوار ہل گئے مگر سلطان شاہ کے قدموں میں ذرا بھی جنبش نہ ہوئی۔ وہ رکا ضرور مگر ڈر کر نہیں احترام۔

میں کل ہی اکبر سے اس کا نکاح پڑھوا کر اسے والیت کی حوالی بھیج رہا ہوں۔ وڈیرہ حق نواز نے حکم سنایا۔

وہ ذرا سا پلٹا۔

کہ بہت دور ہے بابا سائیں۔ اس کا چہرہ تنا ہوا تھا پھر وہ رکا نہیں اور بڑے بڑے ڈگ بھرتا لابی سے نکل گیا۔

شباہت زرد پھولوں کی طرح سے
دہکتی گ پر منڈلا رہے ہیں
صلا عام بہ نظارگی ہے
پتنگے راستے دکھلا رہے ہیں
تشنگی، تشنگی بجھا ہے
اور پھر تشنگی محبت کی
غیر محدود ہوتی جاتی ہے

ادی عابدہ نے شاہ لطیف کے کلام سے نظریں ہٹائیں تو چونک پڑیں اور جلدی سے کتاب بند کر کے ٹیبل پر رکھ دی۔

چھوٹے گھنگھروؤں کی  واز پر رک کر پلٹا اور جیسے زیمل حق نواز کے سامنے کائنات کا رقص تھم گیا۔ ساری  وازیں دم توڑ گئیں۔ بس صرف دل کے دھڑکنے کی  واز سنائی دیتی رہی۔ اس کا جوان کڑیل وجود اس کی نگاہوں کے سامنے تھا جس کی صرف جھلک دیکھ دیکھ کر وہ بیٹھے بیٹھے جذبوں کے دریا میں بہنے لگی تھی۔  ج روبرو دیکھ کر دیکھتے رہ جانا بالکل لاشعوری فعل تھا۔

وہ اپنے قد کاٹھ کی وجہ سے ہی بچل سے مختلف نہ تھا بلکہ وہ تو ہر انداز، ہر طور سے اس سے مختلف تھا۔

بلقیس خود نہیں  ئی؟ اس ن  جیسے بہت بھاری ساعتوں کا بوجھ اٹھاتے ہوئے  ہستگی سے پوچھا۔ وہ مدہوشی کے عالم سے نہ نکلتی تو شاید وہ دبے پاؤں یوں ہی چلا جاتا۔

نہیں۔ مختصر جواب میں کوئی عاجزی یا جی حضوری نہیں تھی۔ وہ ایسا ہی تھا، اڑیل، تند خو، کم میز اور متکبر۔ بقول بچل کے چار جماعتیں پڑھ کر دماغ خراب ہو گیا ہے۔ شہر کے کالج میں پڑھ کر خود کو منسٹر سمجھنے لگا ہے۔

بڑا پیارا کرتا ہے، بلقیس کو شکریہ کہہ دینا۔ اس نے صاف جھوٹ بول دیا، حالانکہ ابھی کرتا ہوں ہی تہہ کیا ہوا اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ تو بس ان لمحات کو طول دینا چاہتی تھی۔

اسے میرا سلام کہنا۔ وہ جانے کے لئے رخ موڑ چکا تھا۔ اس  واز پر لمحہ بھر رکا اور بغیر پلٹے سر کو ذرا سی جنبش دے دی۔

وہ بچل نہیں تھا نہ ہی اس حویلی کا کوئی ملازم کہ ہاتھ باندھے اس کے سامنے کھڑا رہتا

کیا ہوا زیمل، کیا ہوا اماں۔ وہ زیمل کی طرف بڑھیں جو اپنے بستر سے اتر کر خوفزدہ نظروں سے چاروں طرف نکھیں گھمارہی تھی، ساتھ ہی ساتھ وہ خود کمتی جا رہی تھی۔ اس کے سیاہ بال پشت پر اور گے سینے پر بکھرے ہوتھے کالی رات اور بھی سیاہ نظر رہی تھی۔

کیا ہوا بچڑی زیے۔ اس نے اسے بازوؤں میں بھرلیا۔

نیند نہیں رہی ہے کیا۔

ادی ادی وہ بابا سائیں مم مجھے مار ڈالیں گے ہاں ادی وہ مجھے گولی مار دیں گے۔ اس نے خوف سے پھیلی نکھیں عابدہ کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔ اس کی وحشی ہرنی سی نکھوں میں خوف کا ایک جہاں تھا۔

ادی، میں سچ کہہ رہی ہوں، ادا مہران کو میں نے قتل نہیں کیا وہ یوں پ۔۔۔

ہاں ہاں دھی ہمیں خبر ہے وہ اپنی غلطی سے مرا ہے، چل ادھر بیٹھ، بابا سائیں تجھے نہیں ماریں گے وہ بھلا تجھے کیوں مارنے لگے۔ تو بھی ان کی دھی ہے۔ وہ اسے تھام کر بیڈ پر لے ئیں۔ اور بٹھانے لگیں۔

بیٹھ زیمل۔ اس نے اس کا بازو دبوچ لیا۔ اس کے چہرے پر خوف پھیلا ہوا تھا ایک وحشت ٹپک رہی تھی۔

مجھے ڈر لگ رہا ہے ادی۔

چری ہے تو لے یہ گولی پی لے سکون جا گا، اور نیند بھی۔ ادی عابدہ نے دروازے سے گولی

نکال کر اس کی طرف بڑھائی اور گلاس میں پانی بھرنے لگیں۔

ادا مہران کو گزرے (مرے) چار دن ہو گئے ہیں اور تو اک بار بھی نیچے نہیں ئی، اماں نندھی ماں زینت کسی سے بھی نہیں ملے گی، چاچی بھی ئی تھیں پوچھ رہی تھیں تیرا۔ عابدہ اسے باتوں سے بہلانے لگیں۔

نیچے۔۔۔ ہاں نیچے تو میں نہیں گئی مگر، مگر ادی نیچے بابا سائیں ہیں مجھے ڈر لگتا ہے ان سے۔ اس نے پانی سے گولی اتار کر ایک گہرا سانس لیا۔ اسی دم دروازہ کھلا۔ وہ اچھل کر بید سے کھڑی ہو گئی۔ خوف اس کی رگ میں لہو بن کر دوڑنے لگا مگر نے والا سلطان شاہ تھا، جسے دیکھ کر وہ سنبھل گئی۔

خیر تو ہے نا ادا۔ عابدہ اسے اس وقت اپنے کمرے میں دیکھ کر حیران ہو گئیں۔

وہ خاموش رہا پھر چلتا ہوا ان دونوں سے ذرا فاصلے پر رک گیا اس کے چہرے پر غیر معمولی پن دکھائی دے رہا تھا اس کی ناک کے کنارے سرخ ہو رہے تھے اس کی نظریں زیمل کے متوحش چہرے پر تھیں۔ جہاں ویرانی اور خوف اس کی نکھوں سے جھانک رہا تھا۔

خاموشی کا یہ مختصر وقفہ بہت بوجھل تھا پھر اس خاموشی کا سلطان شاہ نے ہی توڑا۔

ادی زیمل کو چادر اوڑھا دو، اور چپل بھی ڈال دو پیروں میں، اور تم بھی چادر اوڑھ لو۔ وہ یہ کہتے ہوئے کھڑکی کے پاس یا اور یونہی پردہ اٹھا کر نیچے جھانکا۔ پھر پلٹا تو عابدہ حیرت سے گنگ کھڑی تھیں۔

میں کچھ کہہ رہا ہوں ادی، زیمل کو چادر اوڑھا دو۔

مم۔۔۔مگر۔۔۔سلطان، کیوں، کیا۔ عابدہ کے دل میں اذیتوں، وسوسوں کے مہیب سا
لرزنے لگے، زیمل اپنی جگہ سن کھڑی تھی۔

میرے پاس کسی سوال کا جواب نہیں ہے ادی جو کہہ رہا ہوں وہ کرو بس۔ اب کے سلطان
کے لہجے میں تیزی تھی اور سختی بھی، عابدہ نے مزید کچھ کہنے کی ہمت نہ پا کر الماری سے اپنی اور
اکی چادر نکال کر زیمل کو اوڑھا دی اور ایک خود پر ڈال کر بیڈ کے نیچے سے زیمل کو چپل
نکالنے لگی۔

اب میرے پیچھے چلی ؤ۔ وہ یہ کہہ کر کمرے سے نکل کر سیڑ ہیاں اترنے لگا۔

ادی عابدہ نے نرمی سے زیمل کو تھاما تو اس کا پورا بدن لرز رہا تھا۔ اس نے بے بس نظروں
سے عابدہ کی طرف دیکھا مگر وہ نظریں چرا گئیں۔

وہ خود نہیں جانتی تھیں کہ سلطان شاہ کس مقصد سے یہ سب کر رہا ہے۔ وہ ان دونوں کو اس
ڈھلتی شام میں کہاں لے جانا چاہتا ہے، یہ بابا سائیں کا کوئی حکم تھا یا اس کا اپنا کوئی فعل۔

زیمل اور وہ کسی روبوٹ کی طرح اس کے پیچھے سیڑھیاں اترنے لگیں لابی سے گزرتے
ہوان دونوں کے قدم رک گئے۔ خری کنارے پر وڈیرہ حق نواز سرخ چہرہ اور انگارہ نکھیں
لیے کھڑے تھے۔

سلطان یاد رکھنا، زیمل کے لیے ج کے بعد اس حویلی کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند

ہوں گے۔ان کی گونج دار وازابھری۔

زیمل نے چہرے سے چادر ہٹا کر ان کی طرف دیکھا پھر دوڑ کر ان کے قدموں میں جھک گئی۔

بابا سائیں میرا قصور کیا ہے، میں نے کیا جرم کیا ہے کیا کر رہے ہیں یہ پ لوگ میرے ساتھ۔اس کی سسکیاں لابی میں گونجنے لگیں۔

سلطان شاہ اس طرف یا زیمل کو پکڑ کر ایک طرف ہٹا دیا۔

یہ باتیں ہم بعد میں کریں گے بابا سائیں۔اس کا لہجہ بیلوچ تھا وہ زیمل کو تھامے تیزی سے لابی عبور کر گیا۔

وڈیرہ حق نواز اگر چاہتے تو اپنے دمیوں سے اس پل سلطان شاہ کو روک سکتے تھے۔ زیمل کو گولی سے اڑا سکتے تھے۔

مگر۔

وہ ایسا نہیں کر پایا وہ خود کو اندر سے بےبس محسوس کر رہے تھے۔ان کا جوان کڑیل بیٹا ان کے ارادوں میں حائل تھا۔وہ کوئی کمدار یا غریب کا بیٹا نہیں تھا کہ اس سے سختی کر لیتے وہ تو خود ان کا اپنا خون تھا۔اگر وہ مکمل ہی باغی ہو جاتا تو وہ بالکل تہی داماں ہو جاتے۔ایک بیٹے کو کھو دینے کے بعد وہ خود کو بیحد کمزور محسوس کرنے لگے تھے۔

سلطان شاہ زیمل کو جہاں لے کر جا رہا تھا وہ جانتے تھے مگر وہ بیٹی کی وجہ سے بیٹے کو کھونا

نہیں چاہتے تھے انہیں سلطان شاہ کی ضرورت تھی ہر حال میں۔

ادا بتاؤ تو سہی کہ کدھر کو لے جا رہے ہو تم ہمیں۔

ادی عابدہ نے پجیرو میں بیٹھتے ہو ایک اور کوشش کی۔ مگر سلطان شاہ کے لبوں پر خامشی کا قفل پڑا تھا۔

ان سب کے بیٹھتے ہی غلام احمد نے پجیرو گے بڑھا دی۔ شام کا سرمئی اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ مگر اس سرمئی مدھم روشنی اور سرسراتی ہوا میں درختوں کے پتوں کی حرکت کو دیکھا جا سکتا تھا۔

پجیرو گوٹھ کے اونچے نیچے رستوں پر ہچکولے کھاتی تیزی سے بھاگ رہی تھی کچھ دیر بعد چاچا ولایت نواز کی کوٹھی دکھائی دینے لگی تو زیمل کا سانس اٹکنے لگا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، اس نے سلطان شاہ کو دیکھا جو اگلی سیٹ پر سرد مہری کیساتھ بیٹھا تھا وہ لب کاٹ کر رہ گئی۔

مگر دوسرے پل پجیرو چاچا سائیں کی کوٹھی سے گے نکل گئی اس نے پیچھے مڑ کر پہلے کوٹھی کو پھر ادی عابدہ کی طرف دیکھا۔

ادی عابدہ نے نرمی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا۔ مگر زیمل کا دل خوفزدہ پرندے کی طرح سینے کی چہار دیواری میں پھڑ پھڑاتا رہا، اچانک ایک تیز سسکاری اس کے لبوں سے آزاد ہو گئی۔

ادا سلطان اگر اگر مجھے مارنا ہی ہے تو حویلی میں ہی مار ڈالو، دیکھو مجھے جنگل میں نہ چھوڑ

دینا مجھے کسی تنہا گھر میں نہ ڈال  نا۔مم مجھے بہت ڈر لگتا ہے تنہائی سے اندھیرے سے۔

وہ خوفزدہ بچے کی طرح سسک رہی تھی عابدہ کا سینہ رنج سے شق ہو گیا سلطان شاہ نے رخ موڑا وہ عابدہ سے لپٹ کر رو رہی تھی۔

پاگل ہو گئی ہے زیمل، تو بہن ہے میری، میں تجھے بھلا کیوں مار ڈالوں گا۔اور اس کے لبوں پو پہلی بار، نرم مسکراہٹ ابھری۔اس نے پیچھے ہو کر اس کے کندھے پر تسلی دینے کے انداز میں ہاتھ رکھا، بھائی تو بہن کا  نچل ہوتے ہیں بھری دھوپ میں ان کا سائبان ان کی خوشیوں کے رکھوالے، اس کے سلگتے  ں سوؤں سے سلطان شاہ کی  واز بھرا گئی۔

میں نے بغاوت کی ہے حویلی میں موجود فرسودہ رسموں اور رواتیوں سے جس میں کمزوروں کی روحوں کا قتل ہوتا ہے میں اس نظام سے نفرت کرتا ہوں جس میں اندھے مظالم ڈھا جائیں جہاں احتجاج کرنے والوں کو قبر میں سلا دیا جاتا ہے میں پچل کے لیے کچھ نہ کر سکا ادمی عابدہ کے لیے کچھ نہ کر سکا۔

مگر اب۔

پجیر و جھٹکے سے رک گئی، سلطان شاہ نے چونک کر غلام احمد کو دیکھا۔

سائیں، وہ رئیس محمد کو لینا ہے نا۔غلام احمد نے یاد دلایا اور پجیر و سے اترا۔اور اندھیرے میں سامنے چلا گیا کچھ دیر بعد  یا تو اس کے ساتھ فقیر محمد کا بیٹا رئیس تھا۔وہ دونوں پجیر و کے

اگلے حصے میں بیٹھ گئے اور بجیرو پھر چل پڑی۔

زیمل کی بھیگی آنکھوں میں حیرت ہی حیرت تھی آج سلطان شاہ کے منہ سے سننے والے الفاظ ان کے لیے بالکل نئے اور انوکھے تھے۔

رات دھیرے دھیرے قدم جما رہی تھی درخت بڑھتی ہوئی تیرگی میں چھپ چکے تھے۔

کھڑکی کے باہر پھیلا ہوا سکوت اور سناٹا ایک بار پھر ہیبت ناک محسوس ہونے لگا۔ عابدہ حق نواز نے پردے گرا دیے۔

وہ دونوں ابھی تک یہ پوچھنے کی ہمت نہ کر پا رہی تھیں کہ وہ یہ گاڑی کن راستوں پر لیے جا رہا ہے۔

پتا نہیں رات کا کون سا پہر تھا کتنے بج رہے تھے بس ہر طرف گھور اندھیرا تھا۔ بجیرو جھٹکے سے رک گئی تو سلطان شاہ کے ہمراہ وہ دونوں بھی اتر گئیں۔

سامنے ایک گھر تھا جس کے دروازے کے باہر چھوٹا سا بلب روشن تھا ان دونوں کے بیحد حیرت ہوئی وہ شہر میں پہنچ چکے تھے۔

سلطان شاہ نے زیمل کا بازو تھاما تو وہ پوری جان سے کانپ اٹھی اس نے سلگتی نگاہوں سے سلطان شاہ کو دیکھا مگر وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا اس کی ساری توجہ اس دروازے کی طرف تھی جسے رئیس محمد بجا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد دروازہ کھلا۔

اور وہ سب اندر داخل ہو گئے۔ گھر کے اندر کی روشنی میں زیمل پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے چادر میں چھپا چہرہ حیرت سے کھل گیا۔

سجاول اس کی نگاہوں کے سامنے تھا، جو خود بھی گنگ تھا۔

میں جانتا ہوں سجاول تم میرا استقبال کسی خوشی سے نہیں کرو گے بلکہ مجھے یہاں دیکھ کر حیران ہو رہے ہو گے۔

سلطان شاہ نے ہاتھ گے کیا جو مصافحے کے لئے تھا۔ مگر سجاول نے اسے نظر انداز کر دیا۔

اسکی نظریں سلطان شاہ سے ہٹ کر پیچھے چادروں میں لپٹی ہوئی ان دو عورتوں پہ جا پڑیں۔ اور جیسے ہی زیمل حق نواز کے چہرے سے چادر ہٹی تو وہ اپنی جگہ ششدر رہ گیا مگر دوسرے پل اس کے ہونٹ بھینچ گئے۔ پیشانی کی رگیں ابھر ئیں اس نے نگاہوں کا زاویہ بدل لیا۔

میں یہاں ۔۔، پ میں سے کسی کے بھی استقبال کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوں۔ اس نے گھوم کر رحیمیں کو بیحد کڑی نظروں سے گھورا۔ وہ جو ایک طرف کھڑا تھا۔

سجاول کی نظروں میں غصہ دیکھ کر سہم گیا۔

سلطان نے کوئی جواب نہیں دیا، اسی دم کمرے کا دروازہ کھلا۔

پٹ اتنی رات کون ہے خیر تو ہے۔ اماں کی واز ابھری ان کے ہمراہ بلقیس بھی تھی جو

سلطان شاہ اوراس کے ساتھ کھڑی زیمل کو دیکھ کر حیرت سے ششدر تھی۔

مگراس کی حیرت کو زیمل نے گے بڑھ کر توڑ ڈالا۔

بلقیس۔وہ بیاختیار اس سے لپٹ گئی۔

ادی عابدہ نے گے بڑھ کر لرزتی ہوئی سجاول کی ماں کو تھاما۔

رئیس، ہم، ہم بیقصور ہیں میرا پٹ بیقصور ہے۔وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر سلطان شاہ ک قدموں میں گرنے لگیں سلطان نے جلدی سے انہیں اوپر اٹھا دیا۔

نہ چاچی میں رئیس سلطان بن کر نہیں یا۔یہاں، میں تو سجاول کے پاس ایک بہن کا بھائی ایک ضرورت مند بن کر یا ہوں، ایک التجا لے کر۔اس کا لہجہ رئسوں کی طرح دبنگ نہیں تھا بہت عام سا اور قدرے نرم تھا۔اماں نے بھگی ہوئی پلکوں کو جھپک کر بیقینی سے اپنے نحیف بازو پر ہاتھ رکھے رئیس سلطان کو دیکھا۔

کیسی التجا کیسی ضرورت۔ان کی واز میں لرزش تھی۔

میں زیمل کو لے کر یا ہوں ماسی، ایک بھائی بن کر یا ہوں اور اس کا عقد سجاول سے کرانا چاہتا ہوں۔اس کی واز لمحہ بھر کے بعد چھا سکوت میں کسی بم کی طرح پھٹی۔

سجاول اپنے پیروں پر مضبوطی سے نہ جما کھڑا ہوتا تو یقیناً لڑکھڑا جاتا، اس نے پوری نکھیں کھول کر رئیس سلطان کو بیقینی کے ساتھ دیکھا۔ادھر بلقیس کے بازوؤں میں دھیرے دھیرے سسکیاں بھرتی زیمل پر سناٹا چھا گیا تھا۔

سبھی اپنی جگہ ششدر تھے سوا سلطان کے۔

سجاول، حق، اور سچائی کا علم جس کسی کے بھی ہاتھ میں ہو میں اس ہاتھ کا ہمیشہ سے احترام کرتا رہا ہوں۔ تم یہ مت سمجھو کہ اس تاریک سیاہ رات میں محض تمہارے زیان اور نقصان کی تلافی کی خاطر یا ہوں، نہیں میں اتنا باظرف نہیں ہوں۔ تمہارا جو نقصان سجل کی موت کی صورت میں ہوا ہے اس کا ازالہ ممکن نہیں ہے اور ہمارا ابھی جو نقصان ہو چکا ہے اس کی تلافی بھی نہیں ہو سکتی۔

سلطان شاہ نے گم سم کھڑے سجاول کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور ایک نظر زیمل پر ڈالی جو ابھی تک ساکت تھی۔

جذبے اور امنگیں کھیل نہیں، ہاں سجول ان میں دل خرچ ہوتا ہے ان کے ٹوٹنے سے پورا انسان ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے گزرتا ہے سجاول تم زیمے کی پہلی اور خری خواہش ہو۔ اس نے زندگی میں کبھی کچھ نہیں مانگا اور پہلی بار مانگنے کی خواہش میں بہت کچھ کھو کر اتنی نادم ہے کہ ہر روایت کی بھینٹ چڑھنے کو تیار ہے۔ مگر ریت رسموں پر صرف کمزوروں کو قربان کرنے کا میں ہمیشہ مخالف رہا ہوں اور ج کھلی بغاوت کی ہے بولو میرا ساتھ دے رہے ہو یا پیچھے ہٹ رہے ہو۔

اس کا چہرہ اور نکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ان میں گہری سنجیدگی بدستور تھی۔

سجاول تو بس اپنے دل میں ہوتے شور کو سن رہا تھا۔ سلطان شاہ چپ ہوا تو کمرے میں

جب تک وہ خود اسے جانے کا اشارہ نہ کرتی یا خود پلٹ کر وہاں سے نہ چلی جاتی۔ وہ

اسے اپنی بہن کی سہیلی ہی سمجھ کر اس کی امانت دینے آیا تھا اور دے کر اب جا رہا تھا۔

وڈیری زیمل حق نواز کو بھی اس کے رویے کا قلق نہ تھا۔ اسے کب جھکے ہوئے سر اور حویلی کے رئیسوں کے سامنے جڑتے اور لرزتے ہاتھ پسند تھے۔

وہ اسے جاتا دیکھ رہی تھی کہ اچانک مہران شاہ کی پجیرو اندر داخل ہوتی دکھائی دی۔ پھاٹک کا گیٹ کھلا اور پجیرو اندر آن رکی۔ اس کی ڈرائیونگ سیٹ سے پچل اور فرنٹ سیٹ سے رئیس مہران شاہ اترے۔ وہ بھی وہیں ٹھہر گیا جبکہ زیمل، مہران شاہ کو دیکھ کر کسی وحشی ہرنی کی طرح چھلانگیں مارتی اندر بھاگ لی۔

عجیب پیاسی زمینیں ہوگئی تھیں آنکھ کی۔ وہ اپنے کمرے میں آئی اور دریچہ کھول کر نیچے دیکھنے لگی۔ مہران شاہ اب وہاں نہیں تھا البتہ پچل اور وہ دونوں آنے سامنے کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ دونوں ایک ہی خون تھے مگر دونوں کا مزاج مختلف تھا۔ دونوں بھائی تھے مگر بالکل علیحدہ شخصیات کے مالک۔ ایک گھر کا ملازم تو دوسرا اس کے دل کا مالک بن گیا تھا۔

پچل اوطاق کی طرف بڑھ گیا۔ وہ جلدی سے پردہ پورا سرکا کر اسے پورچ سے نکلتے دیکھتی رہی کہ بالکل اچانک موڑ کاٹتے ہوئے وہ ٹھٹھکا تھا اور سر اوپر اٹھا کر اسی جانب دیکھا۔

زیمل حق نواز کے ہاتھ سے پردہ چھوٹ گیا۔ اس کا دل سینے کی دیوار سے زور سے

قبرستان جیسی خاموشی چھا گئی اس سکوت کو چند لمحوں بعد سلطان شاہ کی واز اور زیمل کی سسکیوں نے توڑا۔

میرا خیال ہے کہ تم ایک مضبوط اعصاب کے مالک اور زبان پر جان دینے والے مرد ہو تم نے یقیناً زیمل سے وفاؤں کے وعدے بھی کیے ہوں پیچھے ہٹ جانے کا

خوف لے کر تم گے تو نہیں ہو گے بولو سجاول۔

سجاول کا سر اثبات میں ہل گیا۔اس نے سر کو جنبش دے کر اقرار کیا مگر اس کی نکھیں کسی بھی تاثر سے خالی تھیں۔

اس کے اندر ولولے جگانے والے جذبے مر چکے تھے یا اس نے ان پر مضبوط خول چڑھا لیا تھا۔اپنے احساسات کی لو مدھم کر لی تھی۔

اس کی نکھوں کے سامنے بچل تھا،اس کے زخم خوردہ پیر تھے ہاسپٹل کے بیڈ پر اس کی دم توڑتی سانسیں تھیں اس کا اتنا نقصان ہو چکا تھا کہ وہ اب اپنی کسی بشری کمزوری کی گرفت میں نہیں نا چاہتا تھا۔وہ اپنی محبت اور دل ے تقاضوں کو ذرا بھی اہمیت دینے کو تیار نہیں تھا۔

اس کا سر ہلا تھا تو صرف اس لیے کہ سلطان شاہ اسے ایک کمزور مرد بیوفا اور بزدل تصور نہ کرے یا پھر پس پردہ سلطان کی بغاوت کا ساتھ دینا چاہتا تھا۔

سجاول کے اقرار کے ساتھ ہی سب کچھ بہت جلدی میں ہونے لگا۔اور صرف دو گھنٹے کے بعد زیمل حق نواز تین بولوں کا اقرار کر کے سجاول علی شاہ کی بن گئی۔

اسے کچھ ہوش نہیں تھا وہ تو کسی روبوٹ کی طرح سب کے اشاروں پر چل رہی تھی۔

عابدہ خوف اور خوشی کی ملی جلی کیفیت میں تھیں۔ بار بار ان کی نظریں بھٹک کر سلطان پر جاتیں اور ایک فرحت انگیز طمانیت کے احساس کے ساتھ پلٹ تیں سلطان شاہ ایک ٹھنڈے میٹھے چشمے اور بھرپور شجر کی مانند لگ رہا تھا۔

زیمل چادر میں منہ چھپا بیٹھی تھی جب تمام کاروائی کے بعد سلطان شاہ اس کے پاس یا اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ تمام ضبط کھو بیٹھی اور مسہری سے اتر کر اس کے سینے سے لگ گئی۔

ادا میں نے۔۔۔ میں نے ایسا تو نہیں چاہا تھا۔ یوں اس طرح جیسے۔ ان کی نکھوں میں سمندر ٹھہر گیا تھا۔ اس کا بدن لرز رہا عابدہ۔۔۔ خوشی کے نسوؤں کے ہمراہ اسے تھپک رہی تھیں۔

میں جانتا ہوں ادی تم نے خواہشوں کی تکمیل کا یوں نہیں سوچا ہوگا ایسے حالات میں خوشیاں بھی رنج کی طرح لگتی ہیں پر خوشیاں تو بہر حال خوشیاں ہوتی ہیں۔ اس کا احساس رنج چھٹنے کے بعد ہوگا خدا تجھے بادر کھے خوش رکھے۔

پر ادا سائیں بابا سائیں تجھے مار ڈالیں گے ادا اور مجھے۔

اب مجھے مار کر کریں گے چری، ایک بیٹے کو تو کھو دیا انہوں نے۔ وہ اداسی سے مسکرایا پھر اس کا چہرہ اوپر کر کے اس کے نسو اپنی پوروں پر چن لیے۔

تو فکر نہ کر، وقت ہستہ ہستہ خود ہی ساری الجھنیں سلجھا دے گا۔ بیشک ابھی حویلی کے دروازے تم پر بند ہیں مگر ایسا ہمیشہ نہیں ہوگا ادی، ہم اللہ سے اچھی امید تو رکھ سکتے ہیں نا، کچھ پانے کے لیے تھوڑا کھونا بھی پڑتا ہے۔

سجاول۔ اس نیپا سکھڑے سجاول کو دیکھا۔

تم ابھی گوٹھ نہ نا۔ ہمارے بھی ابھی زخم تازہ ہیں بابا کا بھی بہت ویاں ہو چکا ہے۔ کبھی کبھی شیر کی طرح گرجتا انسان بھی بہت کمزور ہو جاتا ہے اور کمزوروں پر حملہ کرنا کوئی بہادری تو نہ ہوگی۔

سجاول کی ستواں ناک کے کنارے سرخ ہو گئے۔

مجھے اتنا کم ظرف اور کمینہ مت سمجھو رئیس سلطان۔ ہاں اپنے نقصان پر تمہیں معاف ضرور کرتا ہوں مگر اسے بھلانے کا وعدہ نہیں کرتا۔ وہ یہ کہہ کر رکا نہیں اور دوسرے کمرے میں چلا گیا سلطان شاہ نے جیب سے سرخ نوٹوں کی گڈی نکال کر زیمل کے ہاتھ پر رکھ دی۔

یہ ایک بھائی کی طرف سے شادی کا تحفہ ہے، خدا تجھے سدا سہاگن رکھے۔ یقین کرو میں بہت مطمئن ہوں۔ خود کو ج ہلکا پھلکا محسوس کر رہا ہوں۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے بوجھ سے جھکے شانے خالی ہو کر ہوا میں معلق ہوں۔

زیمل، سجاول پر مجھے فخر ہے اس نے مرد ہونے کا ثبوت دیا ہ زبان کا پاس رکھا ہے

۔اپنے قول کا پکا ہے یہ لڑکا زیبے تونے یہ منزل خود پسند کی ہے اب ہمت و حوصلے کی دیواروں کو کبھی گرنے نہ دینا۔ایسا نہ ہو کہ کبھی تجھے یا مجھے پچھتانا پڑے اس اقدام پر۔

سلطان اور عابدہ اسے تسلیاں دے کر رخصت ہو گئے۔بلقیس نے روتی زیمل کو خود سے لپٹا لیا۔

مجھے ایسا لگ رہا ہے بلقیس جیسے میرے ایک ہاتھ پر مہکتا گل رکھ دیا ہو اور دوسرے ہاتھ پر دہکتا ہوا انگارہ۔اس نے سسکاری لے کر بلقیس کو دیکھا۔

مجھے خبر ہوتی بلقیس کے محبت کے رستے اتنے پرپیچ اتنے کٹھن ہوں گے تو میں کبھی محبت نہ کرتی تکمیل کی خواہش میں اتنا کچھ برباد ہو جاگا، میں نہیں جانتی تھی بلقیس کہ مجھے کانٹوں سے بھر راستوں پر سفر کر کے اپنے ہمراہ اور بہت سوں کو بھی زخمی کرنا ہوگا، اگر خبر ہوتی تو قسم سے اپنے اپ کو اندر ہی مار لیتی۔ادی عابدہ کی طرح بےحس ہو جاتی۔اپنے تمام جذبوں پر برف گرا لیتی ایک زندہ لاش ہو کر رہ جاتی۔

میں مجرم ہوں تم سب کی، مجھے معاف کر دیں۔ماسی، میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا تھا۔وہ ماسی زرینہ کے قدموں میں گرنے لگی تو انہوں نے جلدی سے اسے کھڑا کر دیا۔

نہ نہ دھی رانی تو تو ہمارے گھر میں خوشی بن کر اتری ہے، میں تو رئیس سلطان کو دعائیں دیتی نہ تھکوں، اماں تو۔۔۔تو میرے سجاول کا نصیب ہے۔ہماری بجھی اندھیری زندگی میں چراغ بن کر آئی ہے۔

اسے کسی ایسے ہی غمگسار کی ضرورت تھی۔ ان ہی ہستیوں کی۔

بلقیس اسے اپنے ساتھ کمرے میں لے گئی اور بہت دیر تک اسے بہلاتی رہی پھر زبردستی منہ دھلوایا اور تیار ہونے کو کہا مگر اس نے کسی بھی قسم کے سنگھار سے انکار کر دیا۔

میں سجاول کی زندگی میں زبردستی مسلط کی گئی ہوں۔ بلقیس یہ سب کیسے کروں، اس نے مجھے اماں دے دی ہے یہی بہت ہے۔ وہ زردگی سے مسہری پر پاؤں لٹکا بیٹھی رہی اور سامنے دیوار کو خالی خالی نظروں سے گھورنے لگی۔

کیسی بات کر رہی ہے زیبے، تو تو ادا سجاول کی پہلی اور آخری خواہش ہے اس کی محبت ہے۔

خواہش تھی مگر اب تو۔ اس نے کرب سے لب دانتوں میں دبا لیے۔

سجاول کا سپاٹ بیتاثر چہرہ نظروں میں گھوم گیا اس کا نکاح کے فوراً بعد اس کے پاس سے اٹھ کر چلے جانا۔ اسے ایک نظر اٹھا کر نہ دیکھا بہت کچھ اسے سمجھا گیا تھا۔

وہ اپنے اندر، اب کسی خوش فہمی کو کیسے پال سکتی تھی وقت اور حالات نے ان دونوں کو ایک کر بھی دیا تو یوں کہ جذبوں اور امنگوں کے چراغ بجھ چکے تھے۔

بلقیس اسے سجاول کے کمرے میں زبردستی چھوڑ گئی تھی وہ عجیب سے احساس جرم کے ساتھ خاموشی سے ایک طرف کھڑی رہی۔

سجاول کمرے کی چھوٹی بالکونی میں کھڑا باہر کے اندھیرے میں جنے کیا تلاش کر رہا تھا۔

اسے اندر تے اور پھر بلقیس کو باہر جا کر دروازہ بند کرتے دیکھ کر یونہی کھڑا رہا۔ اس کی انگلیوں میں سگریٹ دبا تھا جس کا شعلہ اندھیرے میں چمکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

ایسی ہی چمک زیمل حق نواز کی نکھوں میں سجاول کو پلٹتے دیکھ کر دکھائی دی مگر دوسرے پل معدوم بھی ہو گئی۔

اس کا چہرہ سرخ مگر سپاٹ تھا جیسے اس کے سامنے زیمل نہیں کوئی بے کار شے پڑی ہو، پتا نہیں اس نے واقعی دل ہی مار لیا تھا خوشی پیدا کرنے والے جذبے ولولے، مر چکے تھے یا اسے خود پر کنٹرول رکھنے کا ہنر تا تھا یا وہ اس سخت خول میں سمٹا ہوا تھا۔ جسے توڑنے کا حوصلہ کم از کم کمزور سی زیمل میں نہ تھا۔

زیمل حق نواز مجھ سے کسی قسم کی توقعات نہ رکھنا ہو سکتا ہے تمہیں مایوسی ہو۔ اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دی اور نظریں اس کے چہرے سے ہٹا لیں۔

میرے اندر بہت گ ہے۔ وہ سارے خواب ان میں جل چکے ہیں، میرے پاس تمہیں دینے کوئی ٹھنڈے جھونکے نہیں ہیں۔ اس کی واز خشک تھی۔

یونہی ایک موہوم سی امید نے سر اٹھایا تھا اسے قریب دیکھ کر خواہش کا جو شعلہ بھڑکا یا گیا تھا اس کی سرد باتوں نے یکدم ہی بجھا ڈالا وہ ایک طرف رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

میں بھلا ٹھنڈے جھونکوں کی تمنا کر بھی کیسے سکتی ہوں۔ میں تو اس گھر کے ہر فرد کی مجرم ہوں۔ مجھے خون بہا میں یا ہوا مجھ لو سجاول۔ اس کی واز رندھی ہوئی تھی، بہت نسو پینے کی

کوشش میں چہرہ لال ہو رہا تھا۔

سجاول نے اس کی طرف دیکھا مگر جلدی سے نظروں کا رخ موڑ لیا۔

مجھے تو ادا نچل نے اتنی مہلت بھی نہ دی کہ میں اس سے معافی مانگ لیتی، اس کے ایک ایک زخم کا حساب مجھ پر واجب الادا ہے۔میں کیسے تم سے کو ئی تمنا رکھ سکتی ہوں یہی بہت ہے کہ تم نے مجھے میری ہی نظروں سے گرانے سے بچا لیا، ادا سلطان کے سامنے، مجھے معتبر کر دیا۔

اس کا لہجہ شکست خوردہ اور بکھرا ہوا تھا۔

میں ایسا کر کے شاید، پس پردہ سلطان کے حوصلے کو بلند کرنا چاہتا ہوں اور وڈیرہ حق نواز کو کمزور، وہ بیٹے کی اس بغاوت پر یقیناً ٹوٹ چکا ہوگا، بہت قرض نکلتے ہیں زیمل تمہارے اس ظام، سفاک باپ پر، بہت قرض۔۔۔اس نے غصے میں مٹھیاں بھینچ لیں جیسے گ کے دل سے شعلے اٹھتے محسوسو ہو۔

تم ن میرے پیروں میں ایک زنجیر ڈالی دی ہے زیمل کہ میں۔وہ چلتا ہوا اس کے قریب یا۔وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو کر اس کے مقابل چلی ئی۔

نہیں سجاول میں تمہیں نہیں روکوں گی، تم بابا سائیں سے ہر انقام لے سکتے ہو۔

سجاول نے جلتی نظروں سے اسے دیکھا پھر اس کے دونوں شانوں پر اپنی دونوں ہتھیلیاں جما دیں۔

کیا انتقام لوں، ایک انتقام تو قدرت سے مہرنا شاہ کی موت پر لے ہی لیا دوسرا سلطان

شاہ کی بغاوت نے اسے کمزور کر دیا ہے۔ اور اب میں کمزور سے انتقام لے کر کیا کروں گا۔ اس کے پاس فخر کرنے کا اب رہا ہی کیا ہے۔ اور تم نے یہ بات کیوں کہی کہ خون بہا میں ئی ہو۔ اس نے سخت فہمائشی نظریں اس کے چہرے پر ڈالیں تو سا کیلیوں پر ایک مجروح مسکراہٹ بکھر گئی۔

اس نے اپنی نم نم پلکیں اوپر اٹھائیں جس میں درد کی پرچھائیں لرز رہی تھیں کتنا قریب تھا وہ چہرہ جیسے پانے کی تمنا دل میں پھول کھلا دیا کرتی تھی کتنا پیاسا، مگر خود کو سیراب نہیں کر سکتا تھا۔

سامنے دریا رواں تھا مگر ہاتھ بڑھا کر ایک گھونٹ نہیں بھر سکتا تھا۔ دونوں کی نظریں ملیں تو کتنی دیر وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے مگر عالم مدہوشی کا یہ

وقفہ بہت مختصر تھا سجاول نے اچانک اسے دور دھکیل دیا۔ اس کی دونوں ہتھیلیاں یوں جلتی محسوس ہونے لگیں جیسے انگاروں نے چھو لیا ہو اس کے اندر گ بھڑکی اٹھی نکھوں کے سامنے ہزاروں دکھ تازہ ہو گئے رگوں میں بھی دکھ گردش کرنے لگا۔

اس نے بہت جلد اپنی بشری کمزوری پر قابو پا لیا۔ پھر رکا نہیں اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ زیمل حق نواز نے اپنے دل سے اٹھنے والی درد کی لہروں کو برداشت کرتے ہوا دھ کھلے دروازے کو دیکھ ۔

کیسے نہ سمجھوں کہ خون بہا میں ئی ہوں ان ہی کے ساتھ تو ایسا سلوک کیا جاتا ہے۔

وہ وہیں کرسی پر ڈھے سی گئی۔

بے دم ہو بیمار دوا کیوں نہیں دیتے

تم اچھے مسیحا ہو شفا کیوں نہیں دیتے

درد شب ہجراں کی جزا کیوں نہیں دیتے

خون دل وحشی کا صلہ کیوں نہیں دیتے

بربادی دل جبر نہیں فیض نہیں کسی کا

وہ دشمن جاں ہے تو بھلا کیوں نہیں دیتے

دن بڑا بوجھل تھا۔ سجاول ناشتا کر کے بہت سویرے نکل گیا تھا، وہ ایک طرف بیٹھی منتظر ہی رہی کہ وہ اسے مخاطب کرے اس کی طرف دیکھے مگر وہ تو ایسا پتھر ہو چکا تھا۔ کہ

کاموں میں ہاتھ بٹاتی رہی بار بار ماسی اسے ٹوکتیں۔ بلقیس اس کے ہاتھ سے کبھی برتن لیتی کبھی کپڑا چھین لیتی۔

پہلے دن کی دلہن بھلا کسی کام کو ہاتھ لگاتی ہے۔ ماسی زرینہ اسے پیار سے سرزنش کرنے لگتیں۔ اس کے لبوں کی تراش میں مضمحل سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

دلہن تو بڑے ارمانوں سے لائی جاتی ہے۔ ڈھول پٹاخوں، باراتیوں کیساتھ میں ایسی قسمت والی دلہن کب تھی۔ جو یہ تکلیفات کروں۔ اس نے اپنی ہتھیلیوں کو دیکھا جہاں سجاول کے نام کا ایک پھول نہ تھا۔

حالات نے اس کی خواہش اور تمنا پوری کی بھی تو یوں کہ وہ تمناؤں کے پالینے کی خوشی بھی نہیں منا سکتی تھی کھل کر ہنسنا چاہتی تو نسو نکلتے تھے۔

ادا سجاول کچھ اچھا نہیں کر رہا تیرے ساتھ۔ بلقیس اس کے نزدیک موڑھے کے پاس بیٹھ کر بہت پرملال لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

میں اسے کہوں گی بھلا تمہارا کیا قصور ہے۔

قصور میرا نہیں تو اس کا بھی کت ہے، محبتیں چھین کر یا زبردستی حاصل نہیں کی جاسکتیں۔

اس سے زیادہ برا کیا ہوسکتا ہے کہ احساس دلا کر خفگی دکھا کر دو محبت بھرے بول حاصل کیے جائیں۔ چری فخر تو جھولی پھیلا بغیر مل جانے میں ہوتا ہے۔ پھیلائی ہوئی جھولی بھر بھی جا تو روح کو وہ شانتی نہیں ملتی۔ وہ فخر اور خوشی نہیں ملتی۔

اس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بلقیس کو دیکھا۔ لقیس کا دل دکھ کی گہرائیوں میں ڈوب گیا،

مگر یہ تو ظلم ہوا نا تمہارے ساتھ۔

نہیں میں تو ایسا نہیں سمجھتی، میں بہت خوش ہوں بلقیس۔

سچ ادی میں بہت خوش ہوں۔ اس نے بلقیس کی گود میں رکھے اس کے ہاتھ پر اپنا ٹھنڈا ہاتھ رکھ کر دبا ڈالا۔

بلقیس اس کی نم نم پلکوں اور پھیکی مسکراہٹ کو دیکھتی رہ گئی۔

ٹکرایا۔ چہرہ یوں لال ہو گیا جیسے سجاول سومرو نے اسے چھولیا ہو۔ دوبارہ پردہ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہ ہو سکی۔ وہ چلتی ہوئی بیڈ کے کنارے بیٹھ گئی۔ اس نے محسوس کیا اس کا دل انجانی راہوں پر چلنے لگا ہے، اس کی ہستی غیر محسوس طریقے سے ایک انقلاب سے دوچار ہو گئی ہے۔

اسے کہو بہت نامراد شے ہے جنوں

اسے کہو کہ مجھے ہے بہت جنوں اس کا



میں سچ کہہ رہا ہوں مجھے تو یہ وڈیری زیمل تھوڑی پاگل لگتی ہے۔ اس نے مسکراہٹ دبا کر پھر کہا۔ بلقیس نے خفگی بھرے انداز میں احتجاجاً اس کے آگے روٹیوں کی تھالی پٹخنے والے انداز میں رکھ دی۔

ایسی کونسی پاگلوں والی حرکت کی ہے اس نے؟ وہ اس کے سامنے چوکی پر منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔ پاگل لوگ ایسے ہوتے ہیں کیا؟

ایسے ہی تو ہوتے ہیں۔ وہ سر جھکا کر مسکراتے ہوئے روٹی توڑنے لگا۔ چشم تصور میں اس کا بے خود سا انداز لہرانے لگا۔

مجھے تو تم لگتے ہو پاگل، وہ تو بہت اچھی ہے۔ اس کے لہجے میں زیمل کے لئے پیار ہی

اس روز سجاول یا اور جیب سے ایک تہہ شدہ پرچا نکالا۔

فقیر محمد کا پٹ رریئس یا تھا وہ یہ خط دے گیا ہے حویلی سے یا ہے تمہارے لیے۔

اس نے وہ خط اس کی گود میں ڈال دیا اور خود باتھ روم میں چلا گیا۔ حویلی کے نام سے ہی اس کا چہرہ کھل اٹھا اور اس نے جلدی سے تہہ کیا ہوا پرچہ کھولا ادی عابدہ نے بہت پیار لکھا تھا اسے۔

سکھی زیمل۔

امید ہے تو خوش ہو گی حویلی میں بہت خیر ہے۔ تم فکر ہر گز نہ کرنا بابا سائیں بالکل چپ چاپ ہین، ادا سلطان سے بھی کوئی جھگڑا نہیں ہوا ہاں البتہ چاچا ولایت نے بہت طوفان کھڑا کیا۔ خراتی جائداد ہاتھ سے نکل جانے پر دکھ تو ہو گا۔ پر بابا سائیں نے انہیں کوئی جواب نہیں دیا ہے۔ یہ بتا سجاول کیسا ہے اس کی محبت کے پھولوں سے دامن بھر کر تو، تو بہت نکھر گئی ہو گی۔ خدا تمہارے دامن کو ہمیشہ مسرتوں سے بھرا رکھے، میں یہ خط جلدی میں لکھ رہی ہوں۔

بڑی مشکل سے بھاگل کو رمیس کے ہاتھوں بھجوا رہی ہوں۔

باقی یہاں سب خیر ہے۔ اماں دعا دے رہی ہیں، زیمل۔ کچھ کھو کر کچھ پایا جاتا ہے۔ پر میں کہتی ہوں تو نے جو کھویا ہے اس سے زیادہ پا لیا ہے۔ اچھا میری طرف سے بلقیس اور ماسی زرینہ کو سلام

شال سدا ئیں خوش رہیں

فقط دعا گو

ادی عابدہ حق نواز۔

وہ خط ہاتھوں میں لیے گم سم بیٹھی رہی۔ پھر خط لبوں سے لگایا۔

خبر نہیں ادی جو کھویا وہ اچھا ہے یا جو پایا ہے وہ۔۔۔ میرے ہاتھ اور، میرا دامن تو خالی کا خالی ہے۔

کس کا خط ہے۔ وہ تولیے سے منہ پونچھتا باہر آیا۔ اس نے خط لبوں سے ہٹا لیا اور تہہ کرنے لگی۔

ادی عابدہ کا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور خط ٹیبل کی دراز میں ڈال دیا۔

کیا لکھا ہے۔ اس نے تولیہ بیڈ پہ پھینکا اور عدم دلچسپی سے پوچھا۔

کیا لکھنا ہے، دعا دے رہی تھیں سدا خوش رہنے کی۔ اس نے یہ کہتے ہو سجاول کی طرف دیکھا جو اپنے کرتے کی آستینیں موڑتا ہوا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نظریں ملنے پر رخ موڑ لیا۔

خوشیاں بہت مہنگی ہو گئی ہیں زیمل حق نواز یہ خوشیاں بھی تتلیاں ہیں ان کے پیچھے جتنا بھاگو یہ اتنی دور بھاگتی ہیں۔ جھپٹ لو تو ٹوٹ کر بکھر جاتی ہیں۔ اس کی آنکھوں میں موجود سنجیدگی میں اداسی کا دھواں بھی پھیل گیا۔

چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو تو سمیٹ کر دامن بھرا جا سکتا ہے نا۔ وہ آہستگی سے بولی۔

اگر ہوں تو نا۔ وہ ہنس پڑا، بڑی اداس اور ٹوٹے ہو شخص کی سی ہنسی تھی۔

انہیں ڈھونڈا جاتا ہے سجاول علی شاہ۔

سجاول جھٹکے سے اس کی طرف ذگوما اس کی نظریں نیچی تھیں وہ اپنے لب دانتوں میں دبا نسو پینے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ چلتا ہوا اس کے مقابل یا۔

مانوس اور دل کے بے کل کر دینے اولی خوشبو زیمل حق نواز کے س پاس پھیل گئی۔

ڈھونڈا انہیں جاتا ہے جم گم ہوگئی ہوں، جو ختم ہوگئی ہوں جو بجھ چکی ہوں انہیں ڈھونڈا نہیں جا سکتا۔ اس نے زیمل کی لرزتی پلکوں پر نظریں جما دیں۔ اسی پل زیمل نے خمدار پلکوں کی باڑھ اوپر اٹھائی اور سجاول کو اپنا دل سینے کے مضبوط حصار سے نکلتا ہوا محسوس ہوا۔ سکی خوابیدہ نکھوں میں کیا کچھ نہ تھا۔ پلکوں کی نوک پر جھلملاتے قطرے بڑی بوجھل اور پگھلا دینے والی داستان سنا رہے تھے۔ یہ نکھیں، خمدار پلکیں اس سے ذرا سے فاصلے پر ہی تو تھیں یہ قطرے جنہیں وہ ہاتھ بڑھا کر اپنی پوروں میں چن سکتا تھا۔

مگر چن کیوں نہیں رہا تھا اس کی انا نے قدم روک رکھے تھے یا خود کو سیراب کرنے کی خواہش ہی مر چکی تھی، یا اتنے دکھوں نے اس کے اندر کے موسموں کو سلا دیا تھا۔

وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا وہ اپنے ہی شوریدہ سر جذبوں کی تندہی سے خوفزدہ ہوگیا جو ساحل دل پر سر پٹخنے لگے تھے۔

میں نے کہا نا مت توقعات باندھو مت خوشیوں کی منتظر رہو سب کچھ جل چکا ہے اس گ میں جو تمہارے باپ اور بھائی نے لگائی تھی۔ اب صرف راکھ کا ڈھیر ہے اور اس راکھ

کے اندر چنگاریاں ہیں جل جاؤ گی اگر کریدنے کی کوشش کرو گی تو۔اس نے بڑی بیرحمی سے اسے ایک طرف دھکیل دیا۔اور گے بڑھ کر چٹائی پر زور سے لات ماری۔

اس کا دل چاہ رہا تھا ہر چیز تہس نہس کر دے۔زمیل حق نواز تپے ہو چہرے کے ہمراہ اس کے سامنے گئی۔

میں کریدوں گی اس راکھ کو،کون ہوتے ہو تم مجھے روکنے والے میں اس راکھ میں اس شعلے کو بلند کرنا چاہتی ہوں جو جلاتا نہیں ہے بلکہ روشنی بکھیرتا ہے۔

زیمل۔اس کا ہاتھ فضا میں بلند ہوا مگر پھر دوبارہ پہلو میں گر گیا۔

ناؤ گیٹ وٹ مت ش میرے سامنے ورنہ۔میں کچھ کر بیٹھوں گا۔تمہیں دیکھتا ہوں تو ۔۔۔تو قتل کر دینے کو جی چاہتا ہے۔میری باپ تمہاری نظروں میں جاتا ہے۔تو ارن ڈالو سجاول علی شاہ۔ایک بار ہی مار ڈالو یہ بار بار کی شکستگی کی مت سے ایک بار مر جانا ہی اچھا ہے۔

بکواس مت کرو۔وہ دھاڑا۔

مجھے کسی سے کوئی انتقام نہیں لینا فار گاڈ سیک،میری زندگی میں اتنی الجھنیں مت پیدا کرو۔میرا سکون پہلے ہی غارت ہو چکا ہے اس میں مزید پتھر مت پھینکو۔

اور میرا سکون۔اس نے گھائل نظریں اس پر ڈالیں تو وہ شدت ضبط سے رخ موڑ کر دروازے کی طرف بڑھا۔

میں تم سے کوئی نظر کرم کی بھیک نہیں مانگتی،میں تو وہ بھی نہیں مانگتی جو میرا جائز حق

ہے۔

اس کے اٹھتے قدم رک گئے وہ ایڑیوں کے بل پلٹا۔

ہاں، میرا جائز حق سجاول شاہ تم نے مجھ سے نکاح کیا ہے مجھے باہوش وحواس قبول کیا ہے، اتنے لوگوں اور گواہوں میں مجھے اپنایا ہے میں بھاگ کر نہیں ئی تمہارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں دیا نہ پستول کی نال پر نکاح ہوا ہے ہمارا، پھر یہ انتقام تم کس سے اور کیوں لے رہے ہو۔

ہاں ہاں میں نے نکاح کیا ہے تم سے، مگر صرف اس لیے کہ مجھے اپنا قول نبھانا تھا، تم سے کیے گئے وعدوں میں ایک یہ بھی وعدہ تھا کسی بھی ناموافق حالات میں پیچھے نہ ہٹنے کا۔

جھوٹ بول رہے ہو تم۔ وہ اچانک ہسٹریائی انداز میں گ بڑھی اور اس کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑنے لگی۔

جھوٹ ہے یہ سب۔ اس پر اچانک دیوانگی طاری ہوگئی تھی اس کی انگلیوں میں سجاول کا دبا گریبان چر کے ساتھ پھٹ گیا۔

تم نے کوئی وعدہ نہیں نبھایا تم صرف ادا سائیں کو بابا سائیں کے سامنے سرخرو ثابت کرنا چاہتے تھے اور انہیں بیٹے کی بغاوت کے ہاتھوں شکست دینا چاہتے تھے تم مجھے ادا سائیں کے ساتھ واپس بھیج دیتے تو یقیناً وہ بابا سائیں کی فتح ہوتی۔ مگر نہیں تم نے بہت دور کا سوچا سجاول، اپنا فائدہ اپنی تسکین اپی فتح کا سوچا صرف اور صرف بابا سائیں کی شکست اور اپنی فتح کا۔

میری حیثیت تمہاری نظر میں دو کوڑی کی نہیں تھ؛۔ میں نے تمہیں جو سمجھا، تم وہ تو نہیں

نکلے، تم تو بہت عام سے انا پرست، موقع پرست مرد نکلے۔ اپنے مفاد کا سوچنے والے، اپنے نفع ونقصان کا حساب لگانے والے، تم نے میرے کسی خواب کی تعبیر نہیں دی میری رزو کی تکمیل نہیں کی بلکہ اپنا حساب بیباق کیا ہے۔

بولو جواب دو میں جھوٹ بول رہی ہوں یا سچ۔

وہ عالم دیوانگی میں بھی، ساتھ ساتھ رو بھی رہی تھی اسے جھنجھوڑ رہی تھی مگر اونچے قد کاٹھ کا سجاول بالکل بھی لڑکھڑایا نہیں تھا۔ وہ تو کسی چٹان کی طرح ایستادہ تھا۔ تاہم اس کے اعصاب پر اس کے یہ حملے کوڑے کی طرح لگ رہے تھے۔

ہستہ ہستہ اس کے چہرے کے حساس حصوں پر سرخی پھیلنے لگی، سانے اس کے دونوں ہاتھ ایک جھٹکے سے اپنے گریبان سے جھٹک دیے اور پلٹ کر کمرے سے نکل گیا۔ وہ وہیں فرش پر نڈھال ہو کر بیٹھ گئی۔

ادا خیر تو ہے۔ اسے بیرونی دروازے کی طرف بڑھتے دیکھ کر بلقیس بھاگ کر اس کے پیچھے ئی تھی زیمل کی سسکیاں وہ سن کر پریشان ہو گئی۔ اس نے دروازے کی چوکھٹ پر ہاتھ رکھے ذرا گھوم کر بلقیس کو دیکھا۔

اندورنی خلفشار اس کے چہرے پر سرخی کی صورت رقم تھا۔

جاؤ اندر زیمل کے پاس جاؤ، اس وقت اسے تمہاری تسلیوں کی ضرورت ہے۔

معاف کرنا ادا، اسے میری نہیں تمہاری ضرورت ہ۔ جانے کیسے بلقیس نے جی کڑا کر کے

کہہ دیا۔

ایک دو پل وہ اس کی طرف دیکھتا رہا پھر زور سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

اتنے ظالم تو تم کبھی نہیں تھے ادا سائیں پھر یہ خول کیوں چڑھا رکھا ہے، میں جانتی ہوں اس خول کے اندر تو ویسا ہی سٹھا دھیما پیرا سجاول ہے۔ جس کا دل زیمل کی محبت سے لبالب بھرا ہے بھلا ادا سچل کا بدلہ اس بیچاری سے کیا لینا ادا۔

بلقیس دروازہ بند کر کے دل پر رنج لیے اس کے کمرے کی طرف چل دی سجاول نہ سہی وہ تو اس کے سلگتے تپتے نسو پونچھ سکتی تھی۔

کمرے کے گھور اندھیرے میں یکلخت روشنی ہو گئی اس نے نکھوں سے بازو ہٹا تو ماسی زرینہ اس کے بیڈ کے سرہانے کھڑی تھیں۔

اماں پ۔ وہ اٹھ بیٹھی، تب دروازہ کھول کر سجاول بھی اندر داخل ہوا۔

خیر تو ہے اماں۔ اس نے سب کے چہروں پر غیر معمولی پن محسوس کر کے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

تمہارے لیے خیر کی خبر نہیں ہے، البتہ ہمارے لیے خیر ہی خیر ہے۔

سجاول۔ ماسی زرینہ نے پلٹ کر سجاول کو غصے اور ناراضگی سے دیکھا۔

شرم نی چاہیے تجھے، کیوں اس غریب کے پیچھے پڑ گیا ہے جب یہی کچھ کرنا تھا تو کیوں

ہامی بھری تھی نکل جا کمرے سے۔

نہیں اماں، اسے کہنے دو اچھا ہے جو زہر ہے وہ نکل جا۔ اس نے بڑی گھائل سی نظریں سجاول پر ڈالیں پھر جھکا دیں۔ ماسی زرینہ اس کے نزدیک بیٹھ کر اسے پیار سے سہلانے لگیں۔

میرے اندر کوئی زہر نہیں ہے۔ میں تو صرف یہ خبر سنانے آیا ہوں کہ وڈیرہ حق نواز پولیس کی حراست میں ہے۔ وہ دو قدم آگے آیا اور گویا اس کے سر پر بم ہی دے مارا۔

کمرے میں یکلخت سناٹا پھیل گیا، ماسی زرینہ کی پلکیں رنج سے جھک گئی دروازے کا پردہ تھامے کھڑی بلقیس نے بہت دکھ کے ساتھ زیمل کو دیکھا۔ جو اس خبر پر

بیجان سی بیٹھی رہ گئی تھیں۔

میں آج گوٹھ گیا تو خبر ہوئی کہ عزت دار وڈیرہ حق نواز سلاخوں کے پیچھے بڑی بیبسی کی تصویر نظر آ رہا ہے۔ بہت مقدمے ہیں اس پر۔

بس کرو، پلیز بس کرو۔ وہ کرب سے چلائی۔

اس کے اعصاب بری طرح متاثر ہوتے تھے۔ اس نے تھرتھراتے ہونٹوں پر انگلیاں رکھ کر اپنی سسکیاں دبانا چاہیں مگر دوسرے پل ماسی زرینہ کے مہربان بازو اسے اپنی پناہوں میں لینے کو آگے بڑھے تو وہ ان کے سینے میں سما کر سسکنے لگی۔

جا سجاول، اللہ کے واسطے کمرے سے نکل جا، تو اتنا ظالم ہوگا میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ وہ

بیٹے کو غصے اور دکھ سے دیکھنے لگیں۔

اماں، اس میں میرا کیا قصور ہے میں نے تو انہیں جیال نہیں بھجوایا۔ اس نے کندھے اچکا کر اماں کی طرف دیکھا جنہوں نے غصے سے رخ پھیر لیا۔

ئی ایم سوری زیمل حق نواز، مگر یہ حقیقت ہے اور میں یہ سفاک حقیقت تم سے چھپا کر تمہارے ساتھ زیادتی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ایک نظر روتی ہوئی زیمل پر ڈالی اور پھر کمرے سے نکل گیا۔

زیمل کو لگ رہا تھا اس کا کلیجہ پھٹ جا گا۔ بابا سائیں کو سزا ملے۔ ایسا تو اس نے کبھی تصور میں بھی نہیں سوچا تھا۔ وہ اس کا باپ تھا۔ اس کی ماں کا سہاگ حویلی کا سائبان۔

دوسری صبح وہ سب گوٹھ جا رہے تھے وہ رات بھر کی روئی اتنی نڈھال تھی کہ اس سے اب ایک قدم چلنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ سجاول کمرے سے نکلا تو ٹھ گیا وہ اپنی سیاہ چادر سے نکھیں رگڑ رہی تھی سرخ سرخ ستا ہوا چہرہ رات بھر کی جاگی متورم نکھیں اور اس پژمردہ گامی۔ اس کی شکست جاں نے اس کا دل ہلا کر رکھ دیا۔

وہ اس کی طرف یا اور نرمی سے اس کے شانے پر اپنا بازو پھیلایا۔

تم چاہو تو ان سے جا کر مل بھی سکتی ہو۔ میں تمہیں نہیں روکوں گا۔ اور حویلی میں چند دن رہنا چاہو تو رہ لینا۔

اس نے متورم نکھیں اوپر اٹھائیں، پھر جھکا دیں اور اس کا ہاتھ جھٹک دیا اس کی

پگھلا دینے والی قربت سے دور ہٹ گئی۔ جس کی  نچ اس کی رگ رگ کو جلانے لگی تھی۔

تم بھول رہے ہو سجاول علی شاہ، میں اتنی مہربانیوں کے قابل نہیں ہوں۔

زیمل۔اس نے اس کا ہاتھ تھامنا چاہا مگر وہ  گ بڑھ گئی۔

میں جانتی ہوں تم بہت خوش ہو، مگر میں تمہاری اس خوشی میں شامل نہیں ہو سکتی، سوری سجاول، اتنا حوصلہ نہیں ہے میرے پاس، وہ میرا باپ ہے جیسا بھی ہے، مگر میری رگوں میں ان ہی کا خون ہے، مجھے  ج بھی ان سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔ وہ بغیر پلٹے بولی، پھر بلقیس کی طرف بڑھ گئی جو کمرے کے دروازے کو تالا لگا کر نکلی تھی۔اور اس کے ساتھ ہی باہر گاڑی میں جا کر بیٹھ گئی۔

سجاول خود بھی چپ چاپ  کر بیٹھ گیا۔

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر

انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں

یہ وہ سحر تو نہیں جس کی  رزو لے کر

چلتے ے یار کہ مل جا گی کہیں نہ کہیں

فلک کے دشت میں تاروں کی  خرح منزل

کہیں تو ہو گا شب سست موج کا ساحل

کہیں تو جا کے رکے گا سفینہ غم دل

پیار تھا۔

اچھا کتنی؟ اس نے چائے کا کپ لبوں سے لگاتے ہوئے پوچھا۔ اس لمحے اس کی خوبصورت نکھوں میں بے تحاشا چمک تھی۔

بہت زیادہ پتا ہے ادا، میں اس سے تمہاری بہت سی باتیں کرتی ہوں۔ وہ بڑی خوش ہوتی ہے سب سن کر۔ تم نے اتنا بہت سا پڑھا ہے اسے سب خبر ہے۔

جانتا ہوں۔ اس نے جیسے سامنے بیٹھی بے خبر بلقیس سے نگاہیں چرا لیں۔

سارا دن بس باتیں کیے جانا۔ اماں کمرے سے باہر نکلیں۔ چل جا، پانی دے مجھے۔ وہ سامنے چارپائی پر بیٹھ گئیں۔ بلقیس کے اٹھتے ہی وہ سجاول کی طرف متوجہ ہوئیں۔

پھر تو نے کیا سوچا، مہتاب خان کے پٹ (بیٹے) کے سلسلے میں۔ بچل کی صلاح تو یہی ہے کہ جلد از جلد اس چھوری کو اپنے گھر کا کر دیں۔ لڑکا اچھا ہو، اپنی زمین ہو، اپنا گھر ہو تو پھر کیا دیکھنا ہوتا ہے۔ کیوں پٹ (بیٹے) تیرا کیا خیال ہے۔ بچل تو لڑکے سے مل بھی چکا ہے۔ اسے تو کوئی برائی نظر نہیں تی۔ تیرے ابا بھی راضی ہیں۔ بلقیس اماں کو پانی دے کر فوراً وہاں سے چلی گئی تھی۔

اری اماں، میں ٹھہرا جاہل گنوار۔ اسے میری صلاح سے کہاں اتفاق ہوگا۔ یہ پڑھا لکھا ہے، خود سوچنے دے اسے۔ اسی لمحے بچل اندر داخل ہوا۔

بے شک تعلیم اچھے برے کی تمیز سکھاتی ہے۔ سمجھ بوجھ عطا کرتی ہے۔ پر ادا تم بڑے ہو

اتنے دنوں اس نے حویلی میں قدم رکھا تو آنکھیں یوں جل تھل ہوگئیں جیسے سیلاب کی زد میں آیا ہوا گاؤں۔ عابدہ بھاگ کر آئی تھیں اس کی آمد کی خبر سن کر، گھر کی ساری عورتیں اس سے مل رہی تھیں۔

اماں تو جیسے برسوں کی ترسی ہوئی اس کو چوم رہی تھیں۔ اور وہ اپنے آنسوؤں سے نڈھال بابا سائیں کا پوچھے جا رہی تھیں۔

سب ٹھیک ہو جا گا۔ تو کیوں فکر کرتی ہے۔ سلطان شاہ نے اسے ڈھارس دی۔

سچ کہہ رہے ہو ادا، بابا سائیں کو سزا تو نہ ہوگی نا۔

مگر ان پر اتنے مقدمے۔

میں نے کہا نا، سب ٹھیک ہو جا گا یہ بتا سجاول خود کہاں ہے، اور یہ تو نے رو رو کر اپنی کیا حالت بنالی ہے بابا پہلی بار حویلی آئی ہے ذرا اچھے دھج کرتی، اماں عابدہ بھی اس کی خاطر مدارت تو کرو پ لوگ بھی بس رونے بیٹھ جاتی ہو۔ اس نے کہا تو سبھی کو ہوش آگیا۔ اماں اسے اپنے ساتھ اپنے کمرے میں لے گئیں۔

اس نے بابا سائیں سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو سلطان شاہ نے منع کر دیا۔

ادی، سلطان جھوٹ بول رہا ہے ناں، بابا سائیں پر بہت مقدمے ہیں نا۔ رات کے کھانے کے بعد وہ عابدہ کے ساتھ اپنے اسی پرانے کمرے میں آگئی تھی۔

ہاں، وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ عابدہ صاف گوئی سے بولیں پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں

لے کر تکنے لگیں۔

یہ تو اور میں بلکہ سب جانتے ہیں کہ ان پر ڈھیروں مقدمے بن سکتے ہیں، پر ادا اس لیے تجھ سے کہتا ہے، فکر نہ کر کہ بابا سائیں ایک بڑے زمیندار جاگیردار ہیں ان پر جتنے بھی مقدمے ہوں۔ وہ روپوں کے زور سے ختم بھی ہو سکتے ہیں۔

یہ پیسہ یہ اقتدار بہت طاقتور چیز ہے۔ انہوں نے چا کا مگ اس کی طرف بڑھایا۔ پھر خود لے کر اس کے سامنے بیٹھ گئیں۔

ہاں ادی پر رشتوں کی محبت بہت سی حقیقتوں سے نظریں چرانے پر مجبور کر دیتی ہے، میں تو بس بابا سائیں کی رہائی کے لیے دعا گو ہوں ان سے ایک بار ملنا چاہتی ہوں اپنی کوتاہیوں کی معافی مانگنا چاہتی ہو ادی۔

میں ے اپنی خواہشوں کے ہاتھوں ان کی نافرمانی کی ہے وار شاید یہ اس کا نتیجہ ہے کہ میں خوشیوں کو اب تک ترس رہی ہوں، خالی دامن ہوں ادی، میر یہاتھوں میں جو ب مہکتے پھول دکھائی دے رہے ہیں نا یہ پھول نہیں انگارے ہیں جنہیں میں نے بھی پھول کے دھوکے میں تھاما تھا اور۔

اس نیچا کا مگ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ عابدہ متحیر رہ گئی اور بےیقینی سے زیمل کو دیکھنے لگیں۔

زیمے تو۔ اسکے ہونٹ کھلے مگر کپکپا گئے۔

ہاں ادی۔ میں خوش نہیں ہوں خوشی کیا ہوتی ہے میں تو اب تک اس کے معنی ہی نہیں جان پائی کسے کہتے ہیں یہ ہوتی کیا ہے کیسے دل کی روح کو شانت کرتی ہے۔ میرے من میں تو مسلسل آگ جل رہی ہے بس۔

کیا کہہ رہی ہے زیمل۔ کیوں، تو بھلا خوش کیوں نہیں ہے، کہاں ہے سجاول، اس نے تو تجھ سے اپنی رضا سے شادی کی ہے پھر پھر یہ۔ عابدہ اپنی جگہ سے اٹھیں اور اسے جھنجھوڑنے لگیں۔ غم اور حیرت سے ان کے اعصاب شل ہو گئے تھے۔ ایک بوجھ ان پر آن گرا تھا۔

اس نے سلگتی آنکھیں اٹھا کر عادبہ کو دیکھا۔

شادی کوئی خوشی کا نام نہیں ہے، کسی کو پانے کا یا اپنی فتح کا نام نہیں ہے، اس نے شادی تو کی ہے پر۔۔۔ جھوڑ چھوڑ ادی تو نہیں سمجھے گی۔ وہ دلگرفتگی سے اس کا ہاتھ جھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ اور اضطرابی انداز میں بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگی۔

مجھے بتا زیمل، کیا ہو رہا ہے، تیرے ساتھ، کس بات کی سزا مل رہی ہے تجھے۔ عادبہ ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھیں اور اس کی کلائی پکڑ کر کھینچی مگر وہ چپ رہی لیکن اس کا چہرہ اس کی آنکھیں اپنی داستان سنا رہیتے۔ اس کا ملول چہرہ عابدہ کے دل کو مسل رہا تھا انہوں نے اسے بازوؤں میں بھر لیا۔

میں تو سمجھ رہی تھی کہ بابا سائیں کا سن کر تیرا یہ حال ہوا ہے، مجھے کیا خبر کہ تو۔۔۔ زیمل، میری دھی تو تو اجڑی ہوئی لگ رہی ہے ہم تو تجھے اپنے گھر آباد سمجھ کر مطمئن تھے مجھے بتا چری کیا

دکھ ہے تجھے۔ انہوں نے اسے خود سے لپٹا لیا تو اس نے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوا نہیں سب کچھ بتا دیا۔

اس لمحے اسے کسی غمگسار کی طلب ہو رہی تھی جو اس کے تپتے صحرا جیسے دل پر ٹھنڈی پھوار جیسی تسلی رکھے۔

میں اب اس حویلی سے کہیں نہیں جاؤں گی ادی، میرے مقدر میں یہی حویلی ہے۔ سجاول تو اسے منع کر دینا۔ جب یوں بھی تنہا رہنا ہے تو یہاں پڑے رہنے میں کیا برائی ہے۔ اس کی بیرخی بیگانگی اور نشتر بھر جملوں کے زخم کھانے سے تو یہاں اکیلے رہنا بہتر ہے۔ اس نے عابدہ کی گود میں سر رکھ دیا تو عابدہ نے چونک کر اس کی شکل دیکھی مگر وہ نمہیں مونڈے پڑی رہی۔

ادا سائیں بھی پوچھے تو کہہ دینا کہ یہ ٹھہر نے ئی ہے کچھ ہفتے، اماں اور سب کو یہی بتانا ہے۔

مگر زیمل، یہ کوئی حل تو نہیں، مجھے ایک بار سجاول سے بات کرنے دے۔ میں اسے۔

نہیں ادی۔ وہ جھٹک سے اٹھ بیٹھی۔ اس کے چہرے پر تناؤ تھا۔

مجھے ابھا نگے کی محبت، بھیک میں ملی ہوئی عزت نہیں چاہیے۔ بہت جھک گئی میں، اب میری انا گوارا نہیں کرتی۔ وہ شخص اپنے زخموں کو کھرچ کھرچ کر خود کو ہی نہیں مجھے بھی اذیت دیتا رہتا ہے۔

دکھ کی گرفت میں صرف وہ ہی تو نہیں یا، اماں بابا امداد علی، بلقیس، سب کا ہی مشترکہ غم

ہے، اسے شاید اب یاد رہا ہوگا ادی کہ میں وڈیرہ حق نواز کی بیٹی ہوں مجھ سے اس نے وڈیرے کی بیٹی سمجھ کر ہی شادی کی ہے اور اب اپنے دکھوں اپنے نقصانوں کا حساب بھی یہی سوچ کر لے رہا ہے وہ ایک ظالم، سفاک انسان ہے۔ ادی، اسے گوٹھ والوں کی مظلومیت رلاتی ہے مگر میرے نسو اسے ذرا نرم نہیں کرتے میرے لیے ایسی چٹان بن گیا ہے جس سے ٹکرا کر میرا وجود ٹکڑے ٹکڑے ہو جا گا ادی۔

عابدہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھ گئیں۔ انہیں کچھ بھی سجھائی نہ دے رہا تھا۔ ذہن بالکل مفلوج اور ماؤف محسوس ہو رہا تھا۔ بس دل تھا کہ زیمل کے سلگتے نسوؤں سے بھرا جا رہا تھا۔ انہیں اپنی رگوں میں لہو کی بجا انگارے دوڑتے محسوس ہو رہے تھے۔

انا ہے تم میں بھی تھوڑی بہت بتانا اسے

وہ اب ملے بھی تو مت حال دل سنانا اسے

اکیلے کس سے اٹھا ہے تعلقات کا بوجھ

وہ تم کو یاد نہ رکھے تو بھول جانا اسے

وہ جس گ میں جل رہی تھی اس کی کھولن شادیاس کا اپنا دل ہی جانتا تھا ادی

عابدہ نے چارہ گر کی طرح اس کے تپتے دل پر مہربان ہاتھ رکھا تھا مگر وہ اس کے زخموں کی گہراء میں کہاں اتر سکتی تھیں۔

اس نے دریچے کا پٹ بند کر کے اسی سے ٹیک لگا کر جلتی نکھیں موندلیں۔

ابھی کچھ دیر پہلے اس نے ملازمہ لڑکی کے ہاتھوں۔اسے لینے نے والے سجاول کو انکار کہلوا بھیجا تھا اور ملنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔

مگر کیا سجاول، اتنا نادان تھا کہ وہ اس کے اس پیغام میں چھپے گریز کو نہ سمجھتا۔

اس نے اپنی کھڑکی سے دیکھا تھا وہ پورچ سے نکل رہا تھا اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ اس کا یہ پیغام اس کے لیے غیر متوقع تھا۔

زیمل۔عابدہ دروازہ کھول کر اندر ئیں ان کے چہرے پر تشویش جھلک رہی تھی۔

یہ کیا پاگل پن ہے کیا چاہتی ہے تو کہ یہ بات پورے گوٹھ میں پھیل جا۔

میں اس الاؤ میں واپس نہیں جاؤں گی اوی جہاں میرے سارے سپنے ساری خوش فہمیاں سارے حواب راکھ ہو گئے۔وہ قطعیت سے کہہ کر مزید سوال جواب سے بچنے کے لیے باتھ روم میں جا کر بند ہو گئی۔

دوسرے دن سلطان اس کے کمرمیں یا وہ بیدلی سے بیڈ کی پائنتی سے ٹیک لگا قالین پر بیٹھی تھی اس کی اجاڑ زندگی کا عکس اس کے چہرے پر پھیلا تھا۔سلطان شاہ کو دیکھ کر وہ اپنی جگہ سے کھری ہو گئی دوپٹہ کھینچ کر سر پر ڈالا۔

بابا سائیں سے ملنا چاہتی ہو۔اس نے کہا تو اس کے ویران چہرے پر گویا بہار کا رنگ اتر یا۔

ہاں ادا کیا وہ رہا ہو کر حویلی گئے۔یہ کہہ کر ایک پل اس کا دل خوف کی دلدلی

زمین میں دھنسا تھا۔ اسکے چہرے پر خوشی کی بجا خوف سمٹ یا۔

نہیں، ابھی رہائی نہیں ہوئی۔ تو فکر نہ کر ہو جا گی یہ معاملہ چند ہفتوں میں تو نہیں نبٹے گا

نا۔ وُمیرے ساتھ مگر ہاں ذرا اپنا حلیہ درست کرلو۔ بابا سائیں تمہیں خوش باش دیکھنے کے متمنی

ہوں گے۔

یہ کہتے ہو اس نے بغور اس کی طرف دیکھا اس کی نظریں اس کے چہرے پر یوں مرکوز

تھیں جیسے وہ اس کے دل کے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا ہو۔

زیمل کی لمبی دراز پلکیں جھک گئیں۔ وہ اضطرابی انداز میں لب کاٹنے لگی۔

سلطان شاہ کے چہرے پر چھائی سنجیدگی میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

میں تمہیں اتنا پاگل نہیں سمجھتا تھا، خواب ہم بھی دیکھتے ہیں، زیے، سپنے ہماری نکھوں

کے پار بھی لہراتے ہیں پر چری، یہ پھول نہیں ہوتے کہ باغ میں پہنچتے ہیں ہاتھ بڑھا کر اپنی

پسند کے توڑ لیں گے۔

یہ دنیا ہیہاں قدم قدم پر حقیقتوں کی تلخیوں سے خوشیاں بھی کشید کرنا پڑتی ہیں۔ یہاں کی

خوشیاں مسرتیں ٹرے میں سجا کر تمہیں نہیں ملیں گی۔ جنت نہیں ہے یہ دنیا۔ اس نے گ بڑھ

کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ۔

چل جلدی تیار ہو کر نیچے جا۔ وہ پلٹ کر کمرے سے چلا گیا۔ وہ کتنی دیر دروازے کے

کھلے پٹ کو ششدر کھڑی دیکھتی رہی۔

تو کیا ادا سائیں کو خبر ہو گئی کہ وہ کس عذاب سے گزر رہی ہے۔

اس نیڑے تھکے انداز میں سوچا پھر سر جھٹک دیا۔

بابا سائیں سے ملنے کی خوشی میں وہ سارسوچوں کو جھٹک کران سے ملنے کو پھر سے بیتاب دکھائی دینے لگی۔

وہ جب سلطان کے ساتھ گاڑی میں کر بیٹھی تو اس کا دل خوف سے دھڑکنے لگا۔

ادا، بابا سائیں تو مجھ سے بہت ناراض ہیں وہ میری صورت دیکھنا گوارا نہیں کریں گے وہ مجھ سے نہیں ملے تو ارے نہیں، انہوں نے تم سے ملنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ پاگل وہ باپ ہیں تیرے چاہے کتنے ہی پتھر ہوں، لیکن اولاد کیل یے ریشم ہوتے ہیں۔

سلطان شاہ کی باتوں نے اس کے ڈوبتے دل کو سہارا دیا۔

اور واقعی بابا سائیں اسے دیکھ کر بہت خوش دکھائی دینے لگے۔ وہ تو انہیں دیکھ کر ضبط کھو بیٹھی۔ اپنے سارے ہی نسو بہا دینے کو تیار تھی جو سجاول کی طرف سے بھی ملے تھے۔

ٹھنڈی چھاؤں ملی تو پچھلی ساری اذیتیں یاد گئیں۔

مجھے معاف کر دینا میری بچڑی، میں نے بہت کچھ کھو دیا ہے اپنے غرور اپنے غصے میں، دھی رانیاں تو بہت نازک ہوتی ہیں ذرا سی دھوپ سے مرجھا جاتی ہیں پتی پتی بکھرنے لگتی ہیں میں نے تیرے سر سے چھاؤں ہی کھینچ ڈالی۔ اگر سلطان نہ ہوتا تو شاید میں ایک اور نا قابل تلافی نقصان سہار رہا ہوتا۔

بابا سائیں۔ وہ ان کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر لبوں سے کبھی نکھوں سے لگا کر روتی رہی۔ وہ کچھ بولنا چاہتی تھی مگر نسو بہنے لگتے تھے۔

وہ جب بابا سائیں سے مل کر باہر ئی، تو یہ دیکھ کر ٹھ گئی کہ سجاول علی شاہ بھی باہر موجود سلطان سے باتیں کر رہا تھا جو بابا سائیں کے مقدمے سے متعلق ہی تھیں۔ وہ اپنی جگہ کھڑی رہی اور ذرا سا رخ موڑ لیا۔ تب اسے دیکھ کر سلطان نے پکار لیا۔

زیمل۔ وہ وہیں سے اسے پکار رہا تھا ناچار اسے اس کی طرف جانا پڑا۔

ٹھیک ہے پھر سجاول تم کل یہیں جانا ہم یہیں سے کچہری چلیں گے تمہارے نے سے یقین کرو مجھے بڑی ڈھارس ملی ہے، اور بابا سائیں کو بھی۔ سلطان کے لہجے میں سجاول کے لیے محبت اور ممنونیت تھی۔ پھر اس نے سجاول کی لائی گاڑی کا دروازہ کھول کر زیمل کو مخاطب کیا۔

بیٹھو۔

ادا۔ اس نے الجھی نظروں سے سلطان کو دیکھا مگر اس کے چہرے پر بدبختی اور سرد مہری رقم تھی۔ وہ چپ چاپ سیٹ پر بیٹھ گئی۔

ڈرائیونگ سیٹ پر سجاول کر بیٹھا تو اس کا دل پہلو میں دھڑک کر رہ گیا، (ادا سائیں میرے ساتھ تم اچھا نہیں کر رہے) اس کا دل بیچارگی اور کرب سے دوچار ہو گیا۔

تو تمہیں سب خبر ہے مگر بجا اس ظالم شخص سے باز پرس کرنے کے۔ پھر مجھے اس کے ساتھ اس جہنم میں دھکیل رہے ہو۔ ہونا خر رئیس سلطان شاہ عورتوں کے غموں کی گہرائی کو کہاں

جان سکتے ہو۔

گاڑی رینگتی ہوئی گے بڑھ گئی وہ سر جھکا بیٹھی رہی۔ ایک نظر پلٹ کر سلطان پر نہ ڈالی جس کے لبوں کی تراش میں مدھم مسکراہٹ تھی نہ ہی سجاول پر ڈالی جو گاہے بگاہے دررزدیدہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

گاڑی جب گوٹھ کے راستوں پر چلنے لگی تو اس نے ایک خوبصورت قدرے سنسان جگہ گاڑی روک دی س پاس سبزہ ہی سبزہ تھا حد نگاہ تک خریف کے دوشالے سوکھ رہے تھے۔

درختوں کے سبز پتوں سے پانی ٹپک رہا تھا، سارا ماحول مہک رہا تھا۔ ساری فضا کھنک رہی تھی مگر زیمل حق نواز کو کوئی تازگی کوئی نغمگی محسوس نہ ہو رہی تھی۔

گاڑی رکنے پر اس نے نظریں اوپر ضرور اٹھائیں مگر سجاول کو اپنی طرف دیکھتا پا کر جھکالیں اور چہرے کا رخ کھڑکی کی طرف کرلیا۔

مجھے حویلی میں چھوڑ دینا۔

تم شاید بھول گئی ہو۔ اب حویلی میں تمہارے لیے کچھ نہیں رہا۔ وہ دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پر رکھے اسے بغور دیکھنے لگا۔

کرب کا ایک رنگ اس کے چہرے کو چھو گیا۔ اس نے ہونٹوں کو زور سے دانتوں میں دبالیا۔

کیا چاہتے ہو سجاول۔ اس کی واز بے حد پست تھی۔

میرے، تم نے اچھا ہی سوچا ہوگا بلقیس کے لئے۔ سجاول اس کی بات کا برا مانے بغیر بولا اور چائے کا کپ لے کر کھڑا ہو گیا۔

کیا تمہاری تعلیم تمہیں دوسروں کا ادب واحترام کرنا نہیں سکھاتی؟ اس نے چونک کر سچل کی طرف دیکھا۔ اس کا لہجہ بیحد تیکھا تھا۔ وہ قطعی سمجھ نہ سکا۔

رئیس مہران شاہ تمہارے رویے پر بہت غصہ ہوا ہے۔ تم نے انہیں سلام نہیں کیا۔ وہ وڈیرہ حق نواز کا بیٹا ہے اس گوٹھ کا چھوٹا رئیس۔

شکایت کی ہے اس نے تم سے؟ اس کا چہرہ لال ہو گیا۔

نہیں، میں کون سا کہیں کا رئیس سردار ہوں کہ وہ میرے منہ لگے گا۔ وہ چاہتا تو سزا ابھی سنا سکتا تھا تجھے۔ سچل نے پیروں سے چپل اتارے ہوئے بلقیس کو آواز دی مگر چھناکے کی آواز پر اچھل پڑا۔ سجاول نے چائے سے بھرا مگ زمین پر دے مارا تھا۔ اس کا چہرہ لال انگارہ ہو گیا تھا اور نقوش تن گئے تھے۔

بس ہماری اسی سوچ نے ان وڈیروں، جاگیرداروں اور سرداروں کی پگڑی کو سنبھال رکھا ہے۔ زرخرید غلام نہیں ہوں میں کہ جہاں سے بھی گزریں وہاں آنکھیں بچھا دوں ان کے لیے۔ سر جھکا کر، ہاتھ جوڑ کر ان کی تعظیم میں کھڑا ہو جاؤں۔ وہ مجھ پر، میری ذات پر کوئی حق نہیں رکھتے۔

سجاول بلقیس گھبرا کر دونوں بھائیوں کے درمیان آ کھڑی ہوئی۔ ادا تو بس یوں ہی اک

ماضی کی وہ ہنستی مسکراتی سپنے دیکھنے والی زیمل کو دیکھنا چاہتا ہوں۔اس نے اچانک اس کا رخ اپنی طرف کرلیا۔

کہاں گم ہوگئی ہے وہ۔

اس نے بڑی گھائل نظریں اس پر ڈالیں۔

اسے تو تم نے ہی زندہ درگور کردیا ہے، اس کیسارے خواب ساری رزوؤں کو کچل ڈالا ہے، سپنے دیکھنے والی نکھوں کواتنی سزا دی ہے کہ۔۔۔وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپ کر رونے لگی۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر نرمی سے اس کے دونوں کانپتے ہاتھ اس کے چہرے سے ہٹا کر اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

چھوڑو۔وہ اس کا ہاتھ جھٹکنے لگی۔

جذبے کوئی کھیل نہیں ہیں سجاول ان میں دل خرچ ہوتا ہے جاں خرچ ہوتی ہے ہے۔اور تم میرے جذبوں کو میرے خوابوں کو کوئی رعایت دینے کو تیار نہیں تھے۔اس کے نسو تواتر سے بہنے لگے وہ گے بول نہ پائی۔سجاول نے بڑے پیار سے اس کا سر اپنے شانے سے لگا دیا۔

میں چاہتا ہوں تم جی بھر کر رولو وہ سارا غم بہادو جو وقت ہماری جھولی میں ڈال گیا ہے۔

وقت نہیں۔تم نے، تم نے دیا ہے یہ غم یہ دکھ۔وہ کرب سے چلائی۔

ہاں، بو میں ہی اس مداوا بھی کرنا چاہتا ہوں، میں ہی ازالہ کروں گا۔ اس کی واز دھیمی محبت کی مہک سے بھری ہوئی تھی۔

زیمل کا دل جیسے ٹھہر گیا اس نے چہرہ اوپر اٹھایا تو وہ نکھوں میں محبت کا ایک جہاں لیے اسے دیکھ رہا تھا پھر اس کی بھیگی نکھوں میں جھانکتے ہو بولا۔

ہم دکھ سے وہ بوجھل لمحے، وہ ساری باتیں کیوں نہ بھول جائیں وہ اداس کر دینے والی سوچیں کیوں نہ جھٹک دیں۔ اس کے لہجے میں نرماہٹ تھی اس کی نکھوں میں موجزن بی لہروں میں روانی گئی۔

یقین کرو، تمہیں جلا کر میں نے بھی کوئی سکون نہیں پایا۔ میں تم سے کوئی دانستہ انتقام نہیں لیتا تھا زیمل۔ وہ میری لاشعوری حرکتیں تھیں شاید میں جس گ میں جل رہا تھا۔ اس وقت مجھے صرف اس گ کے اٹھتے شعلوں کے علاوہ کچھ اور بھائی نہیں دے رہا تھا۔ حتی کہ اپنی ذات بھی، میں تمہاری جانب قدم بڑھاتا تو دل پر بوجھ بڑھ جاتا تھا خود کو خود غرض اور نفس پرست خیال کرنے لگتا تھا۔

مگر سوچتا ہوں اب کہ وہ سب ہوتا تو تقدیر میں لکھا تھا اس میں کسی کا کیا دوش جس اذیت کا سفر ہم نے کیا وہی تم نے بھی تکلیف اٹھائی بلکہ تم تو کانٹوں سے الجھ کر مجھ تک ٹھنڈی چھاؤں کی تلاش میں پہنچی بھی اور میں نے بجا تمہیں چھپر چھاؤں دینے کے تمہیں دھتکار دیا ئی ایم سوری زیمل۔ اس کی نکھوں کے سارے موتی سجاول بڑے پیار سے چننے لگا۔

اس کی آواز، زیمل حق نواز کی سماعتوں پر یوں اتر رہی تھی جیسے صحراؤں میں بادنسیم چلنے لگی ہو جیسے سوکھی کھیتی پر برکھارت کا سندیسہ لانے والی پھوار گرے۔

وہ حیرت خوشی کے ملے جلے احساسات کے ساتھ بیٹھی رہ گئی تھی۔

وہ کہہ رہا تھا۔

بڑے پیارے خواب دیکھے تھے میں نے بھی زیمل۔ مگر حالات نے جو رخ بدلا، تو سب کچھ بکھر گیا، جب خواب ٹوٹتے ہیں تو دل ٹوٹ جاتا ہے جذبے مرنے لگتے ہیں روح ویرانہ ہو جاتی ہے۔ ایسے میں بہار بھی خزاں دکھائی دیتی ہے رنگ میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی، ہمیں یوں گماں ہوتا ہے جیسے ہم اس متحرک دنیا کا بے کار جزو ہو کر رہ گئے ہوں اب جیسے کبھی نہ ہنس سکیں گے دن میں خوشیاں پیدا کرنے والے ولولے جاں بحق ہو چکے ہیں اب کبھی ان میں زندگی پیدا نہ ہو سکے گی۔

مگر یہ وقتی احساسات اور عارضی کیفیت ہوتی ہے کیونکہ یہ قانون فطرت نہیں ہے اگر ایسا ہوتا تو آج ہر شخص زندہ لاش کی طرح گھومتا پھرتا دکھائی دیتا اپنے عمر بھر کے دکھوں کو سینے سے لگا شکستہ و افسردہ نظر آتا یہ دنیا صرف قبرستان دکھائی دیتی مگر صد شکر کہ ایسا نہیں ہے۔ جو زخم وقت دیتا ہے اس کا تریاق بھی قدرت کی طرف سے کیا جاتا ہے۔

سجاول نے بڑے پیار سے اس کے بال اس کے چہرے سے ہٹا۔

کیا ایسا نہیں ہے زیمل۔ اس نے اس کے ہاتھ پر اپنی بھاری ہاتھ رکھ دیا۔

محبت کی اس حرارت سے زیمل کے چہرے پر دھنک اتر آئی وہ تو بے یقینی کی کیفیت

میں سانس روکے بیٹھی تھی۔

اسکی خوبصورت نکھوں میں بہت سے جگنو چمک اٹھے تھے۔

تم سے نفرت کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔ پاگل۔ کل تک مجھے ٹھنڈی ہوا کے لطیف جھونکے بھی اذیت دے رہے تھے۔ سورج کی پر کیف گرمی میں بھی لطافت محسوس نہ ہو رہی تھی مگر ج ایسا نہیں ہے۔ شکر ہے یہ کیفیت دائی نہیں ہوتی دکھ ہلکے ہو جاتے ہیں ورنہ کتنے رشتے چھوٹ جائیں ہمارے ہاتھوں سے کتنی محبتیں ہم کھو دیں۔

دیکھو زیمل ہر شے گنگنا رہی ہے۔ یہی تو قدرت کا طریقہ کار ہے۔ اس دنیا میں دکھ ہیں اور یہیں سکھ یہاں خزاں بھی تی ہے اور بہار بھی۔ اور جب بہار جا تو۔ خزاں کا دم نکل جاتا ہے مجھے لن یوتا نگ کی نظم کا ایک مصرعہ یاد رہا ہے کہ۔

جب ہوا بہار چلتی ہے تو دل کی کلی بھی کھلنے کو بیتاب ہو جاتی ہے۔

اس کے لہجے اور نکھوں میں سرمستی تھی باتوں میں وہی شرارت اتر ئی تھی۔

زیمل نے لمبی پلکوں کی خوبصورت جھالریں اوپر اٹھائیں تو سجاول کو اپنی طرف دیکھتے پا کر جھکا دیں۔ اس کی نگاہیں اس کیاندر کے شجر میں کسی کونپل کی مہک ڈھونڈ رہی تھیں۔ اور وہ بند کلی کی طرح خود میں سمٹ گئی۔ اچانک اسے اپنی پوزیشن کا خیال گیا وہ گھبرا کر پیچھے ہٹی اس کے قرب کی نچ اسے جھلسانے لگی تھی۔ مگر اس نے اس کے ہاتھ پر اپنی گرفت مضبوط رکھی۔

بولو، زیمل کچھ کہو گی نہیں۔

کیا کہوں بس تم بولتے رہو سجاول کہ بہت اچھا لگ رہا ہے سننا۔ برسوں کی دل کی پیاسی دھرتی جیسے سیراب ہو رہی ہے۔

بولتے رہو سجاول اپنی محبت کا ایقان دلاتے رہو۔

میری تمام تشنگیاں مٹنے لگی ہیں میرے دل کے اجڑے نگر میں روشنی پھیلتی جا رہی ہے۔

میں کیسے یہ طلسم توڑ دوں۔ میں اس سحر سے اب بھی زاد ہونا نہیں چاہتی۔ اس نے اس کے شانے پر سر ٹکا دیا۔

اسی سمان کی چھت تلے

میرا شیاں بھی اڑان بھی

تیری چشم خوش کی پناہ بھی

میرے خواب بھی میرے مان بھی

زیمل۔ اس نے والہانہ انداز سے اسے پکارا۔

اس کے لہجے کی خوشبو اسے تروتازہ کر گئی۔

کیا واقعی تم نے مجھے دل سے معاف کر دیا۔

سجاول کیسی باتیں کر رہے ہو۔ وہ سر اٹھا کر رنج سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ تم نے کوئی جرم نہیں کیا جس کی معافی ہو۔

محبت تو جرم نہیں ہے نا۔ اس نے خود کو بیحد ہلکا پھلکا محسوس کرتے ہوا اس کے چہرے پر پھیلتی

دھنک کو دیکھا اس سمت ذرا سا جھکا تو وہ بیساختہ مسکراہٹ کو نہ روک سکی۔

ہے مگر اس کی معافی نہیں ہوتی سزا ہوتی ہے۔

اس نے دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ کہا،

اوہ یہ سزا مجھے یہیں دینا پسند کرو گی یا پھر گھر پر۔۔۔اس نے شرارت سے اس کی لٹ کو چھوا۔تو وہ شرما کر خود میں سمٹ گئی۔

اس کے حسن کی تابندگیاں جھلملانے لگیں تھیں۔

اسے لگا سجاول کی محبت حوض میں ٹھہرا مقید پانی نہیں تھی بلکہ ایک رواں دریا کی طرح تھی جس کا بہاؤ اسے بہا کر لے جا رہا تھا۔

سجاول گاڑی چلانے لگا اور پھر اسے ان عمارتوں اور زمینوں کے پاس لے یا جو رئیس سلطان شاہ نے اسکولوں کے استعمال کے لئے دے دی تھیں۔

حیرت اور خوشی سے اس کا جبرہ چمک اٹھا اسے لگا مسرتوں سے اس کی جھولی چھلکنے لگی ہو۔

میرے سارے خواب پورے ہو گئے زیمل۔

سجاول بیحد مسرت سے اسے بتانے لگا۔

سجاول، ایک گھر کی طرح، اس وطن کو اس زمین کو حسین اور ثمر بار بنانے کے لیے ہمارے خواب، ہمارے درد، ہماری محبتیں مشترک تھیں نا۔

ہاں زیمل۔

اب ہماری محنت بھی مشترکہ ہوگی میرا دل چاہتا ہے سجاول میں ان اسکولوں میں نے والے ننھے منے بچوں کو اپنے ہاتھوں سے اپنی محنت سے سینچوں ان کے دلوں کے قفل کھول کر انہیں روشنی سے منور کروں۔ سجاول اسے بڑی محبت اور فخر سے دیکھ رہا تھا۔

کیا ایسا ہو جا گا سجاول، کیا ہمارا وطن، ہمارا گوٹھ اندھیروں سے نکل کر روشنی پالیگا۔

انشا اللہ بس یقین محکم، عمل پیہم ---

محبت فاتح عالم ---وہ اس کا جملہ پورا کر کے ہنس دی وہ بھی سر کو ذرا سی جنبش دے کر ہنس پڑا۔

ان دونوں کی ہنسی میں دکھ کا شائبہ تک نہ تھا۔

یہ ہوا خر شب ہے سحر نے کو ہے

رزو کے زرد لہجے میں اثر نے کو ہے

پا سکیں گے بونے والے اپنی محبت کا ثمر

سیپیوں کی ستینوں میں گہر نے کو ہے

ختم ہو جا گا اب یہ سلسلہ بے نشاں

شوق کی منزل، وفا کی رہ گزر نے کو ہے

اختتام-------------------------The End

بات کر رہا تھا۔

نہیں، یہ بات نہیں تھی۔ یہ حویلی کا پیامبر بن کر مجھے وارننگ دے رہا ہے کہ آئندہ میں بھی ہزاروں بے دام غلاموں کی لائن میں کھڑا ہو جاؤں۔ اس کی آنکھوں میں حویلی کے ان مالکوں کے لئے نفرت کے شعلے اٹھنے لگے۔ بچل کھول اٹھا۔

اماں اسے سمجھا لے۔ یہ چار جماعتیں پڑھ کر خود کو رئیسوں کے برابر کی سطح پر سمجھنے لگا ہے۔ ہونہہ ابھی کتابوں کے چند لفظوں کا نشہ ہے۔ شہر کی سڑکوں پر جوتیاں چٹخا کر بھی نوکری نہیں ملے گی تب یہ سارا طنطنہ ہرن ہو جائے گا۔ اسی گوٹھ اور ان ہی کی زمینوں پر سر جھکا کر کام کرنا پڑے گا۔ شہر میں نوکریاں ملنا آسان بات نہیں ہے۔

ہاں اس لئے کہ ان ہی لوگوں نے بااثر جگہوں پر پہنچ کر شہروں میں لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ شہروں کی تباہ حالی کے ذمہ دار یہی لوگ ہیں۔ زمینوں پر کام کرنا کوئی برائی نہیں ہے مگر ان کی غلامی کرنا میرے نزدیک شرک ہے، گناہ ہے، بے غیرتی ہے۔ وہ فرش پر بکھرے کانچ کے ریزوں کو روندتا کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

دماغ خراب ہے اس کا۔ بچل غصہ دباتا چارپائی پر ڈھیر ہو جانے کے انداز میں بیٹھ گیا۔ اماں میں غلط نہیں کہتا۔ اس نے سر پر ہاتھ رکھی اماں کی طرف دیکھا۔ اگر اس کی باتیں اس وڈیرے کے کانوں میں پہنچ گئیں تو دیکھ لینا تیرا یہ بیٹا بہت پچھتائے گا اور ہم سب بھی۔ ہم غریب ہاری لوگ ہیں، جتنی کتابیں پڑھ لیں رہیں گے

ان کے قدموں کے نیچے ہی۔ کبھی ہم ان کے برابر نہیں سکتے اماں۔ زندگی اگر یوں ہی گزر رہی ہے، تین وقت کی روٹی مل جاتی ہے، تن ڈھانپنے کو کپڑا اور چھت مل جائے تو کیا برا ہے۔

وہ بے چارہ ان پڑھ جاہل پہلے سے مرغوب اماں کو سمجھا رہا تھا۔ پس پردہ خود کو تسلی دے رہا تھا۔ کمرے میں بیٹھا سجاول پیچ وتاب کھا کر رہ گیا۔

بس یہی سوچ ایسے ہی خیالات کی پرورش چاہتے ہیں گوٹھ والوں کے ذہنوں میں، یہ جاگیردار لوگ۔ یہی ان کی کامیابی ہے۔ گوٹھ والوں کو تعلیم سے اسی لئے محروم رکھا جاتا ہے کہ ان کی سوچوں کی سطح ہمیشہ ہی اتنی پست رہے۔ ان کے ووٹ، ان کی کرسیاں، ان کی جاگیرداری سلامت رہے۔ چاہے ایک ہی زاویئے سے جھکے جھکے وہ ٹوٹ جائیں۔ ان کی انا، خودداری اور غیرت پر جتنی ضربیں لگیں مگر سر بلند کرنے کا تصور بھی پاس نہ پھٹکے۔ یہ جاہلیت کے اندھیرے ان کی اندھی حکومت کو ڈھانپے ہوئے ہیں تاکہ اس تاریکی میں ان کے گندے میلے کچیلے بے ضمیر وجود دکھائی نہ دیں۔

غصے اور بے بسی کے احساس سے اس کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔ وہ کمرے سے نکلا اور پیروں میں چپل ڈال کر باہر کی طرف بڑھا۔ بلقیس بھاگ کر اس کے پیچھے تک ئی۔

ادا۔

میں ابا کی طرف جا رہا ہوں۔ انہوں نے بلوایا تھا مجھے، شاید کوئی کام تھا۔ اس نے اس

کے پرتشویش چہرے پر ایک نگاہ ڈال کر وضاحت کی اور پردہ اٹھا کر باہر نکل گیا۔



غلام محمد، ذرا گاڑی روکنا۔ زیمل حق نواز کے حکم پر پجیرو کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالے غلام محمد نے جلدی سے بریک پر پیر رکھ دیا۔ گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی۔

اماں اور زینت نے حیرت سے اسے دیکھا۔ بھاگل نے بھی مٹھائیوں کے ٹوکرے کو سنبھالے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ گاڑی یوں بیچ سڑک پر روکنے کی وجہ کسی کی بھی تو سمجھ میں نہ آئی تھی۔

بڑا حبس محسوس ہو رہا ہے۔ یہ جگہ کچھ ٹھنڈی ہے، گرمی بھی لگ رہی ہے۔ اس نے سب کی سوالیہ نگاہیں محسوس کر کے وضاحت کی اور اپنی طرف کا پردہ ذرا سا سرکا کر لرزتی پلکوں کی باڑھ اٹھا کر باہر جھانکا۔

ہاں موسم اچھا ہو رہا ہے۔ زینت نے بھی اپنی طرف کے شیشے کے پردے سرکا کر باہر کی دنیا کو دیکھا۔ اماں نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا مگر پھر سوچ کر چپ ہو گئیں۔

سجاول سومرا حویلی کی مخصوص پجیرو کو رکتے دیکھ کر ٹھٹھک گیا تھا۔ یوں ہی سرسری انداز میں ایڑیوں کے بل گھوم کر دیکھا تو کتنے ہی پل پلکیں نہ جھپک سکا۔ دو پرشوق نظروں سے بڑا

گہرا تصادم ہوا تھا۔ وہ پھول سا چہرا سیاہ چادر کے ہالے میں بڑا دلفریب لگ رہا تھا۔ اچانک پردہ سرکا اور جیسے چاندنی چھٹک گئی۔ دو گلابی بھرے بھرے دلنشیں لب ہولے سے مسکرائے۔ دوسرے لمحے *بجیر وفرائے سے  گے بڑھ گئی۔

جیسے ہر منظر پر روشنی پھیل کر پھر سمٹ کر  گے دوڑ گئی ہو۔ *بجیر و میں اتنی بہت سی  نکھیں دیکھ ہی نہ پائیں کہ وڈیری زیمل نے اپنے دل کی پیاسی دھرتی کو سیراب کر لیا۔ کوئی جان ہی نہ سکا کہ اسے یوں یکا یک گھٹن کا احساس کیوں کر ہوا تھا۔

اور اب۔۔۔۔

ان ہواؤں نے اس کی رگ رگ سے گھٹن کھینچ کر خنکی دوڑا دی تھی۔

یہی ہوائیں تو زینت حق نواز کے چہرے سے بھی ٹکرائیں تھیں اور بھاگل کو بھی چھو گئی تھیں مگر جو سرشاروہ محسوس کر رہی تھی وہ کسی کو بھی حاصل نہ ہوئی۔

چری ہو گئی ہے یہ تو۔ بے خبر اماں ہنس دی تھی۔ ادھر سجاول اپنی جگہ دم بخود ان راستوں کو خالی خالی نظروں سے گھور رہا تھا جن پر *بجیر و گزر کر نگاہوں سے اوجھل ہوئی تھی۔

وہ نجانے کب تک وڈیری کی اس وارفتگی، بے خودی اور دیوانگی کو اپنے دل کے کونے میں محسوس کرتا کہ امداد علی کا ہاتھ اس کے شانے پر پڑا۔

پٹ کوئی چار مہینے سے پریشان ہیں ہم مگر اب تو فصلوں کو بہت زیادہ خطرہ پڑ گیا ہے۔

دوسرے لمحے وہ عالم مدہوشی سے عالم خود شناسی میں یا تو اپنے اطراف بابا سائیں اور دوسرے لوگوں کے چہرے دکھائی دینے لگے۔

نوحہ کناں روتی ہوئی فصلیں اور دکھ ہی دکھ، بے بسی اور بے اختیاری سے جھلسے ہوئے چہرے۔ یہ تو سراسر ظلم ہے ابا۔ یہ پانی کی باری والی بات تو ہم چھوٹے بادگاروں کے لئے سراسر خسارے کا سودا ہے۔

سجاول پٹ اب تو باری کا بھی مسئلہ نہیں رہا۔ وڈیرہ شاہ نواز کے دمیوں نے دھڑلے سے سارے پانی اور پچھلی نہر پر قبضہ کر رکھا ہے۔ فقیر محمد نے اداسی کے ساتھ کہا۔ سجاول کی رگوں میں خون کھولنے لگا۔

پ لوگوں کو محکمے والوں سے بات کرنی چاہیئے تھی۔ خر یہ نہر سب کی ہے اور پانی پر کسی ایک کی اجارہ داری کیوں ہو۔ میں خود جاؤں گا۔

نہ پٹ ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ وہ بڑے لوگ ہیں، زمیندار سرکار لوگ۔ ان کا اس دھرتی کی ہر چیز پر حق ہے۔ یہ محکمے والے ہم جیسوں کو تو منہ ہی نہیں لگاتے۔ ان کی جیبو میں بڑے لوگ روپیہ بھر جاتے ہیں۔

چاچا یہ ملک اب بڑے لوگوں کی جاگیر نہیں ہے۔ یہ سب کے لئے بنا ہے۔ ہر امیر غریب کے لئے ہے۔ اسے حاصل کرنے والے کے لئے بنا ہے۔

اسے حاصل کرنیوالے اسے ان جاگیرداروں اور وڈیروں کو وراثت میں نہیں دے گئے

۔میں خود جاؤں گا حق نواز کے پاس بلکہ ج ہی جاتا ہوں حویلی۔ خر کس جرم میں ہمارا پانی بند کیا گیا ہے، ہمیں ہماری فصلوں سے محروم کیا جا رہا ہے۔اس نے سلگ کر ہاتھ میں پکڑی لاٹھی زمین پر دے ماری۔

نہ نہ پتر، نہ تو حویلی نہ جانا۔خواہ مخواہ بڑے سائیں سے الجھ پڑے گا۔امداد علی خوفزدہ ہو کر زمین سے کھڑا ہو گیا۔

الجھنے کی کیا بات ہے بابا۔میں صرف مسئلہ ان کے سامنے رکھوں گا۔ظاہر ہے جب چناؤ کا موقع سامنے تا ہے تو یہ لوگ گوٹھ والوں کی حمایت ایسے ہی ہزار وعدے کر کے لیتے ہیں کہ اب کوئی بھوکا پیاسا نہیں رہے گا۔ ہر گھر میں چولہا جلے گا۔چھوٹے بادگاروں کے تمام مسائل حل ہوں گے۔اور جب وہ جاہل معصوم گوٹھ والوں کو بہکا کر اچھے عہدے حاصل کر لیتے ہیں تو پھر انہیں کیوں نہ ان کے وعدے یاد دلائے جائیں، خر ان عہدوں کا اثر و رسوخ صرف اپنے لئے ہی کیوں۔ ہمارے لئے کیوں استعمال نہیں ہو سکتا۔وہ سرخ چہرہ لیے پلٹ گیا۔امداد علی اسے پکارتا ہی رہ گیا پھر اپنی پگڑی اتار کر ایک بڑے پتھر پر بیٹھ گیا۔

بابا فقیر محمد اس چھوکرے کو سمجھاؤ۔یہ تو چریا ہو رہا ہے۔اس کی یہ باتیں مجھے بہت ڈراتی ہیں۔جا فقیر محمد اسے سمجھا۔

تو فکر نہ کر امداد علی۔یہ چریا نہیں ہے۔بابا یہ پڑھا لکھا چھوکرا ہے۔سرکاروں سے بات کرنے کا ڈھنگ جانتا ہے۔ہو سکتا ہے رئیس اس کی بات سن کر کچھ ہم لوگوں کے اس مس کلے

پر غور کرے۔ فقیر محمد نے اسے بھی اور خود کو بھی خواب دکھایا۔

خدائے برتر، تیری زمین پر

یہ راہ بھولا ہوا قبیلہ کسی ٹھکانے کو ڈھونڈتا ہے، کوئی ٹھکانہ

جہاں حفاظت، سکون، راحت

متاع، محنت کا اجر، رنگ گل تمنا کی سبز خوشبو

مشام جاں کو بہار کر دے۔



امداد علی بیٹے کے ساتھ احتیاطاً خود بھی یا تھا۔ وہ اندر ہی اندر خوفزدہ تھا کہ جوان خون ہے۔ کوئی سخت بات منہ سے نہ نکل جائے جوان بڑے کو خفا کر دے۔ یوں بھی وہ سجاول کی باتوں سے، وڈیروں کے خلاف زہر اگلتے جذبات سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ان کا بیٹا اس گوٹھ والوں کی بے بسی اور بے اختیاری سے نالاں ہے۔ اس کے خیال میں۔

دکھ کے یہ بوجھل شب و روز پ اپنے ہاتھوں نہیں کٹیں گے۔ ان گوٹھ والوں کے لئے سکون کی منزل خود پ چل کر نہیں ئے گی۔ منزل کے لئے سفر کا شعور ضروری ہے۔

یہی شعور وہ گوٹھ والوں میں پیدا کرنا چاہتا تھا کہ اونچی اونچی حویلیوں کے ٓ گے سر کو جھکا

کر سوائے تذلیل کے، احساس ذلت کی گ اور بھوک کے، کچھ ہاتھ نہیں ے گا۔ وہ حویلیوں ہی کی طرف اگر دیکھتے رہیں گے تو عمر بھر بھکاریوں کی طرح ہاتھ باندھ کرترستی ہوئی اشک بھری نظروں سے خود پر ظلم ہوتا ہوا دیکھتے رہیں گے۔

اب ضرورت ہے ظلم کے خلاف بغاوت کی، جائز حق کے وصول کی تگ ودو کی، جاہلیت کے خاتمہ اور علی الاعلان بغاوت کی۔

یہ باتیں وہ ہر جگہ، ہر شخص سے کرتا تھا۔ جب بھی چھٹیوں میں گھر تا اس کے دکھوں میں اضافہ ہو جاتا۔ اپنے لوگوں کی کم علمی اور بے بسی پر کٹ کر رہ جاتا اور امداد علی بیٹے کے اس جلنے کڑھنے پر خود افسردہ ہو جاتا۔ وہ بھی دوسرے ہاریوں کی طرح لاچار ہی تو تھا۔

سچل نے اپنے باپ اور سجاول کو حویلی میں داخل ہوتے دیکھا تو اس کا دل بری طرح دھڑکا۔ ہزار وسوسے اور خود دامن دل میں سمٹ ئے۔ سجاول کے چہرے پر غیر معمولی پن دکھائی دے رہا تھا۔

یہ لڑکا صرف مہینہ بھر رہتا ہے مگر کتنا پریشان کرتا ہے۔ سچل نے دل میں سوچا۔

اوطاق کے دروازے پر پہنچ کر امداد علی نے ایک ملتجی نظر سجاول کے چہرے پر ڈالی۔

پٹ بات نرمی سے کرنا، غصے میں نہ جانا۔ یہ رئیس لوگ ہیں۔ خفا ہو جائیں تو پھر بنتا کام بگڑ جاتا ہے۔

ہونہہ کام بنتے ہی کب ہیں ہمارے۔ اس نے دل میں سوچا مگر باپ کو کوئی جواب ں ہیں

دیا۔ بس سرخ سرخ لب بھینچ لئے پھر قدرے سلگ کر امداد علی کے دونوں ہاتھ جو سینے کے سامنے جڑے ہوئے تھے پکڑ کر نیچے کر دیئے۔

بابا سائیں ہم اپنے ہی جیسے انسانوں کے سامنے جا رہے ہیں۔ کوئی خدا کے سامنے تو نہیں جا رہے کہ ہاتھ باندھ کر اور سر جھکا کر اندر داخل ہوں۔ وہ پردہ اٹھا کر اندر داخل ہو گیا اپنے اسی اعتماد کے ساتھ جو اس کی شخصیت کا خاصہ تھا۔ جبکہ امداد علی دھڑکتے دل کے ساتھ اندر داخل ہوا تھا۔

ؤ ؤامداد علی کیسے ناہوا بابا۔ ابھی ابھی اوطاق سے وڈیرہ حق نواز کے مہمان اٹھ کر گئے تھے سو وہ وہیں تھا اور مہران شاہ بھی موجود تھا۔ اس نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سجاول کو ذرا چونک کر پھر بڑے غور سے دیکھا۔

سفید شلوار سوٹ میں اونچا لمبا، سرخ چہرے پر اعتماد لئے بھرپور سراپے کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس میں کچھ غیر معمولی پن اسے بھی دکھائی دیا۔ بڑا مضبوط دکھائی دے رہا تھا وہ۔

سلام سرکار۔ امداد علی کے کانپتے ہاتھ مشینی انداز میں وڈیرہ حق نواز کے سامنے جاتے ہی جڑ گئے۔ وہ ایک کونے میں سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

وعلیکم السلام اور سناؤ بابا سجاول کیسے ناہوا۔ سنا ہے بابا، شہر کے کسی کالج میں اپنی ذہانت کی بڑی دھوم مچا رکھی ہے تم نے۔ وڈیرہ حق نواز کے مونچھوں تلے لب مسکرائے تو اس نے بھی ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ یہ ستائش قبول کی۔ بیٹھو، بیٹھو بابا کیسے ناہوا۔ تمہاری پڑھائی وڑھائی

ختم ہو گئی ہے یا ابھی چھٹیوں پر ہی ئے ہو؟

جی چھٹیوں پر ہی یا ہوں، بس اب چند ماہ بعد تو مستقل جانا ہے۔ اس نے اپنے اسی اعتماد کے جواب دیا اور وڈیرہ حق نواز کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

اس کی یہ جرات مہران شاہ کو دنگ کر گئی جبکہ امداد علی اندر ہی اندر اپنے سائیں کے چہرے کے بگڑے زاویئے دیکھ کر سوکھے پتے کی طرح کانپنے لگا۔

کیوں بابا، گوٹھ میں جاؤ گے ہمیشہ کے لئے، تو شہر ویر میں نوکری ووکری نہیں کرو گے؟

وڈیرہ حق نواز کے چہرے پر مکمل ٹھہراؤ اور سکوت تھا۔ یوں جیسے اسے سجاول کی اس حرکت پر کوئی شاک نہ لگا ہو، یا پھر نظر انداز کر رہا ہو۔

جی نوکری تو ڈھونڈتے ہی ملے گی، مگر پہلے میرے کچھ اور ارادے ہیں۔

کیسے ارادے؟ مہران شاہ نے چونک کر اس کی شکل دیکھی۔

کوئی خاص نہیں، فی الحال تو بابا اپنی زمین کا مسئلہ لے کر ئے ہیں۔ اس کا اعتماد بلا کا تھا۔ مہران شاہ کو جانے کیوں اپنی ہتک کا احساس ہوا۔

ایک ہاری کا بیٹا اور حویلی کے وڈیروں کے سامنے جس انداز سے بیٹھا اور گفتگو کر رہا تھا اسے سخت برا محسوس ہو رہا تھا۔ اپنی شان کے خلاف جیسے بڑی ہتنگی سے بغاوت کا علم بلند ہوا ہو۔ جیسے کوئی انقلابی کونپل سیم وتھور والی زمین سے پھوٹ نکلی ہو۔

امداد علی نے اپنا مسئلہ بتایا تو مہران شاہ گویا گرم توے پر جا بیٹھا۔

یہ مسئلہ ڈرف تمہارے اکیلے کا نہیں ہے او گوٹھ کے اور بھی کئی لوگوں کا ہے۔ یہ حکومت کا کام ہے ہمارا نہیں۔

حکومت تک بات تو پ لوگ ہی پہنچا سکتے ہیں نا ذریعے تو پ ہی ہیں نا۔ اس لئے کہ اس گوٹھ سے نمائندگی حاصل کر کے وہاں تک پہنچنے والے پ لوگ ہی تو ہیں۔ سجاول نے غصہ ضبط کرتے ہوئے متانت سے کہا۔ ظاہر ہے گوٹھ والوں نے اسی لئے پ لوگوں کو چنا ہے کہ ان کے مسائل احسن طریقے سے حل ہو جائیں۔ جو کچھ کہا گیا تھا ان پر عمل بھی کیا جائے۔

خوب، تو تم ہمیں اب یہ بتانے ئے ہو کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے اور کیا نہیں؟ مہران شاہ کی نکھیں لال انگارہ ہو گئیں۔

جی۔ اس نے اسی اعتماد سے سر ہلا دیا۔

ٹھیک ہے، ٹھیک ہے یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ مہران شاہ کو اپنی جگہ سے اٹھنے اور کچھ بولنے سے پہلے وڈیرہ حق نواز نے ہاتھ اٹھا کر بڑے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ اس کے ٹھنڈے لہجے میں ملائمت نام کو نہ تھی بلکہ اجنبیت تھی۔

میں ج ہی کچھ دمی بھیج کر معلومات کرواتا ہوں۔ تم سب لوگ اسے اپنے اپنے مسائل اسے بتا دینا۔ مہران شاہ کو اپنے باپ کا یہ انداز یہ اقرار کچھ پسند نہیں یا تھا۔

بس بابا یا کچھ اور۔ وڈیرہ حق نواز مسکرایا تو سجاول سنجیدگی سے اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

مسائل تو بہت ہیں۔ ایک ہی حل ہو جائے تو بہت ہے۔

ہاں تو بابا تم لوگ کمپلین کرو گے، تو ہمیں خبر بھی ہو گی نا، کچھ اور بھی کہنا چاہتے ہو تم؟

انہوں نے بغور اس کا چہرہ دیکھا جہاں ستواں ناک کے کنارے سرخ ہو رہے تھے۔

جی ہاں، ایک کمپلین تو یہ بھی ہے کہ یہاں اسکول کی عمارتیں تو کئی ہیں مگر وہاں پ لوگوں کے دمیوں نے اپنی رہائش گاہیں بنا رکھی ہیں۔ جب ان سے کچھ کہتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ یہ سرکاری اوطاق ہیں، یا مہمان خانے ہیں ہمارا کچھ نہیں۔ کچھ سمجھ نہیں تی کہ برسہا برس سے ایک اسکول تک نہیں کھلتا یہاں پر اور جو عمارتیں بنی ہوئی ہیں انہیں استعمال میں نہیں لایا جاتا۔

امداد علی فخر سے اپنے جوان سپوت کو دیکھ رہا تھا مگر جوں ہی اس کی نظریں رئیس مہران شاہ اور وڈیرہ حق نواز کے چہرے کے بگڑتے زاویوں پر پڑیں، وہ پورے جی جان سے کانپ گیا۔

سارے گوٹھ والوں کا ٹھیکہ صرف تم نے لے رکھا ہے کیا؟ مہران شاہ استہزائیہ انداز میں ہنسا۔

مجبوری ہے، حالانکہ پ کو لینا چاہیئے تھا۔

سجا۔۔۔ ول اپنی اوقات میں رہو۔ مہران شاہ بھ اٹھا۔

جاؤ بابا سجاول تم، ہم پھر تم سے بات کریں گے۔ وڈیرہ حق نواز نے تیوریاں چڑھا کر حکم صادر کر دیا۔ وہ امداد علی کو چھوڑ کر خود غصہ ضبط کرتا ہوا اوطاق سے باہر نکل یا۔

اس کی رگ رگ میں گ بھڑک اٹھی تھی مہران شاہ کے رویے سے وہ یہ جانتا تھا جہاں

گوٹھ والوں کے مسائل کا ذکر ہوگا، جہاں ان کی بہبود کی بات ہوگی وہاں یہ وڈیرے اپنا خول اتار کر اژدھے کے روپ میں جائیں گے، مگر وہ ان گ اگلتے اژدھوں کے خوف سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹائے گا یہ اسکا عزم تھا۔

اور وہ ایسی طاقت اور ایسا عزم ہر فرد کے سینے میں اتارنا چاہتا تھا، وہ حویلی سے باہر نکل گیا اس کے اوطاق سے نکلتے ہی وڈیرہ حق نواز نے ہنکارا بھرا اور کانپتے لرزتے امداد علی کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ کسی لرزیدہ شاخ کی طرح جھول کر فرش پر بیٹھ گیا۔

سرکار جوان بچہ ہے، خون میں جوش رہتا ہے اسے معاف کردیں سرکار۔ اس نے لرزتے سینے پر کانپتے ہاتھ باندھ کر التجا کی۔ مہران شاہ کسی بھرے ہوئے شیر کی طرح اوطاق میں گھوم رہا تھا۔

تو اسے باندھ کر رکھا کر و امداد علی۔ وہ بھڑک کر گرجا۔

ہاں بابا امداد علی، ج تو غصہ پی گیا ہوں میں، پر ئندہ۔

جی جی سرکار، میں اسے سمجھا دوں گا۔ وڈیرے کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی امداد علی نے بیٹے کی زندگی کی بھیک مانگ لی۔

تم جیسے کم کمین بے اوقاتیے اپنے خول میں سمٹ کر رہو اس میں عافیت ہے اسے یہ بھی کہہ دینا کہ، اسے گوٹھ میں دوسرے یان پڑھ لوگوں کو تعلیم سے شنا کرانے کا ٹھیکہ لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، کیا ہم مر گئے ہیں کس لئے، یہ اچی گدیاں سنبھال رکھی ہیں۔

باباصرف باتیں ہی تو نہیں کرتے ہم، تم لوگوں کو جو تین وقت کی روٹی ملتی ہے ہماری وجہ سے تو ملتی ہے باہر نکل کر دیکھو کتنے ننگے بھوکے انسان ہیں مگر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مگر تم لوگ نا شکرے ہوتے جا رہے ہو۔

وڈیرہ حق نواز نے اپنی کرسی پر بیٹھ کر حقہ منہ سے لگا لیا۔

نہ سائیں، یہ بچڑا تو بس ذرا جوانی کا جوش دکھا گیا وہ دل سے آپ لوگوں کی بڑی عزت کرتا ہے۔

ٹھیک ہے ٹھیک ہے جاؤ اب۔ مہران شاہ نے ترخ کر کہا تو وہ سرعت سے زمین سے اٹھا اور دروازے سے اپنی چپل اٹھا کر فرشی سلام کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

خدائے برتر

جو کچھ ہے تو ہے

تجھے یقیناً یہ علم ہوگا

کہ اس زمین پر کچھ ایسی بد بخت بستیاں بھی ہیں۔ جس کے باسی

تیری توجہ کے خواب قریئے میں جی رہے ہیں

تیری توجہ کا خواب قریہ جہاں اندھیرا ہی روشنی ہے

مجھے بتا ان گزشتہ نسلوں کا جرم کیا ہے

یہ کس سے اپنے گناہ پوچھیں

جو اپنے رستے سے بےخبر ہوں

وہ کس طرح تیری راہ پوچھیں

خدائے برتر خدائے برتر

وہ سخت پژمردہ دل ہو رہا تھا۔ تنکے سے خشک زمین پر بے مقصد لکیریں کھینچتے ہوئے جانے اسے کتنی دیر ہوگئی۔

بابا کی اس کے جانے کے بعد کیا عزت افزائی ہوئی تھی اس نے یہ بات بابا کو دلیز سے اندر تے ہوئے اور چارپائی سنبھالتے دیکھ کر محسوس کر لی تھی۔

بے شک بابا نے کچھ نہیں کہا تھا اس سے، مگر نم نکھوں میں اداسی اور کمتری کا ایسا جال پھیلا ہوا تھا جس نے اسے بری طرح کبیدہ خاطر کر دیا تھا۔

اسے لگا جیسے بابا اس کی زبان، اس کے ہاتھ باندھ رہے ہیں۔ اس کے ارادوں کو متزلزل کر رہے ہیں مگر اتنی جلدی محض ایک جھٹکے میں وہ اپنے کب کے باندھے ہوئے ارادوں کو کیسے توڑ دیتا۔

سوائے خدائے برتر کے کسی کے گے جھک جانا اس کی فطرت کے خلاف تھا، وہ ان ہزاروں بتوں کو ان معبودوں کو نہیں پوج سکتا تھا۔

سجاول بٹ فقیر محمد یہاں سے گزرتا ہوٹھ کر رک گیا اس کے قریب چلا یا۔

اسے امداد علی کے ذریعے خبر مل گئی تھی کہ وڈیرے نے اس کی بات کو قابل اعتنا نہیں جانا

تھا۔(یہ تو ہونا ہی تھا)

پتر، تو دل چھوٹا نہ کرو، رابندی ہی سہی گزر ہو ہی جائے گی کل تین وقت کھاتے ہیں آج بھی تین وقت ہی سہی پر ذرا سوکھی کھالیں گے۔

بات دکھ کی یہ نہیں ہے چاچا۔ وہ زمین پر لکیریں کھینچنے کا سلسلہ ترک کر کے پتھر پر سے کھڑا ہو گیا۔

بات بے حیثیت، بے معنی ہو کر رہ جانے کی ہے، بے پر کے پرندے کی مانند زندہ رہنا کوئی زندگی ہے چاچا یہ محرومیاں برسوں سے چلی رہی ہیں، کہیں تو اسکا تدارک ہو۔

کوئی تو یہ ہنی زنجیریں توڑے، کوئی تو گے بڑھے، مار کھا کر مارنے کا حوصلہ پیدا کرے۔

چل زیادہ پریشان نہ ہو، چل اٹھ بچل تیرا وہاں انتظار کر رہا ہے، کہہ رہا تھا چاچا سجاول کو بھیج دینا۔

پت جا، تو چند ہفتوں کے لئے مہمان بن کر تا ہے اور اتنا رنج اتنا بوجھ لے کر واپس جاتا ہے۔ فقیر محمد نے اس کا مضبوط شانہ تھپکا تو وہ مبہم سے انداز میں مسکرا کر گے بڑھ گیا اونچا لمبا قد، چوڑے شانے بھرپور مردانہ چال فقیر محمد اسے دور تک دیکھتا رہا اور دل ہی دل میں سراہ کر ماشاءاللہ کہہ کر اپنے رستے پر چل پڑا۔

سجاول کے رستے میں حویلی کی جیپ اچانک رکی تو وہ بھی ٹھ کر رک گیا۔

غلام محمد ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا اور پجیر و اپنی مالکن کے حکم سے رکی تھی۔ ہنگی سے پچھلی چرف کا ریشمی جالی پردہ اٹھا اور عابدہ حق نواز کا چہرہ دکھائی دیا۔ ایک شوق کا جہاں خود بخود دل میں سمٹ یا تھا فوراً ہی معمول پر گیا۔

السلام علیکم اس نے احتراماً مسکرا کر سلام کیا۔

وسلام کیسے ہو۔ عابدہ زرا سا مسکرائیں اس نے بھی نکھوں کو جنبش دے کر شانے اچکا دیئے۔ ٹھیک ہوں۔

بڑے دن ہو گئے، بلتھس حویلی کی طرف نہیں ئی زیمل بہت یاد کرتی ہے اسے عابدہ حق نواز کے چہرے پر ملائمت اور اپنائیت تھی۔

زیمل کے نام پر احساسات ذرا سے منتشر ہوئے جیسے ساکن جھیل پر چھوٹا سا کنکر گرا ہو۔

پتا نہیں، مجھے تو نہیں پتا میں بھیجوں گا۔

اد اسجاول حویلی کے اندر بڑی گھٹن بڑا حبس رہتا ہے اندر رہنے والوں کے لئے کوئی راستہ کوئی دریچہ نہیں ہے، جو کھلی فضا، زاد ہوا میں کھلتا ہو، نہ گرما دینے والی گرمی کا راستہ ہے نہ یخ بستہ کر دینے والی ٹھنڈی ہواؤں کا، اور یہ چری زیمل کچھ اور ہی سوچ رہی ہے وہ نا سمجھ ہے، پر دل کب سمجھداری کا ساتھ دیتا ہے وہ تمہیں منزل سمجھنے لگی ہے اپنی نجات کا ذریعہ، یہ جانتے ہوئے بھی کہ، راستہ کوئی نہیں ہے اور منزل ڈھونڈنے بیٹھی ہے، ہے ناں پاگل۔ عابدہ حق نواز نے رسانیت سے کہا۔

سجاول دم بخود رہ گیا۔

پھول تھامنا اتنا مسرت انگیز تجربہ نہیں ہوتا جتنا کانٹوں کا چبھ جانا تکلیف دہ ہوتا ہے ہزار کانٹوں میں گھرے پھول کو اٹھانے کی تکلیف کون گوارا کرتا ہے، جس طرح دلدل میں کھلے کنول کو حاصل کرنے کے لئے بھی جستجو نہیں کی جاتی یا۔۔۔۔۔۔۔۔۔پھر یہ وہ باتیں نہیں سمجھتی چلو اللہ حافظ۔۔

پردہ سرک گیا اور زنجیر وسبک روی سے گے نکل گئی، اپنے راستے پر، سجاول سن سا کھڑا رہ گیا جیسے چلنے کی طاقت سلب ہو گئی ہو۔

اڑتی دھول میں زنجیر ونظروں سے غائب ہو چکی تھی، مگر وہ ان راستوں کو ابھی تک، تک رہا تھا خالی ذہن خالی نظروں سے۔

عابدہ حق نواز نے کوئی انکشاف کیا تھا یا کوئی نصیحت کی تھی یا محض اپنی صنف کی کم مائیگی اور لاچاری کا احساس دلایا تھا۔ یا جتا دیا کہ وہ بزدل کم ہمت ہے اور زیمل کی طرف وڈیروں کے خوف سے نہیں بڑھے گا۔ وہ یک وقت کئی احساسات سے دوچار ہو گیا۔

عابد حق نے چادر اتارتے ہوئے کمرے میں قدم رکھا تو زیمل ئینے کے سامنے بیٹھی کلائیوں میں پڑی چوڑیوں سے کھیل رہی تھی۔ کسی گہری سوچ میں گم۔

کیا سوچ رہی ہو۔ انہوں نے چادر لپیٹ کر ایک طرف رکھی پیر چپل سے زاد کر کے بیڈ

پڑ گئیں۔

سوچنا کیا ہے، بڑے دن ہو گئے ہیں بلقیس بھی ئی نہیں ہے جاتی تو کچھ دل بہل جاتا ہے۔ وہ کرسی سے اٹھ کر بیڈ پر بیٹھی۔

میرے ساتھ چلتیں تم چاچی کی طرف۔ ادی عابدہ نے غور سے اس کی شکل دیکھی پھر سر جھکا کر ہاتھوں سے موٹے موٹے کھنکتے کڑے اتارنے لگیں۔

ادی یہ تم کیوں اتار کر رکھ دیتی ہو پہنے رہو نا۔ انہوں نے اپنی مخصوص سنجیدگی سے کہتے ہوئے بیڈ سے اتر کر لاپرواہی سے کڑے سنگھار میز کے خانے میں ڈال دیے۔

سجاول کو کہا تھا میں نے، کہ بلقیس کو بھیجنا حویلی۔ وہ اپنا سادہ سا سوٹ نکالتے ہوئے ذرا سا رخ موڑ کر اس کا چہرہ دیکھنے لگیں جس پر ایک رنگ سا کر ٹھہر گیا تھا۔

سجاول۔۔۔۔۔۔وہ پ کو کہاں ملا ادی۔ اس نے سر اٹھایا مگر پھر دوسرے لمحے نظریں چرا لیں۔

راستے میں کہیں جا رہا تھا، میں نے گاڑی روک کر بات کر لی پگل تو بہن کے معاملے میں بڑا سخت ہے۔

لگتا ہے حویلی کے مالکوں کے ساتھ رہ کر ان جیسا ہی ہو گیا ہے۔ عابدہ کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ تھی۔ زیمل نے جھکی جھکی پلکوں سے نظر بھر کر دیکھا اور باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔

شام کو بلقیس تی تو وہ کھل اٹھی پھر دونوں باغیچے کے مخصوص گوشے میں بیٹھ کر باتیں

کرنے لگیں۔

ارے ہاں تیرے اس رشتے کا کیا ہوا؟

زیمل کو اچانک یاد آ گیا۔ بلقیس بری طرح شرما گئی۔

بات پکی ہوگئی ہے اس لئے تو کہتے ہوئے شرم آ رہی تھی۔ اس نے یہ کہتے ہوئے دوپٹے میں اپنا چہرہ چھپالیا۔ زیمل مارے خوشی کے اسے دیکھے گئی پھر اس کا دوپٹہ کھینچ لیا اور دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس پڑیں۔

اتنی خوشی کی خبر ہے اب مٹھائی تو کھلاؤ گی نا

ایسے نہیں، تم گھر آ کر کھانا۔ بلقیس نے کہا تو وہ ایک لمحے چپ سی رہ گئی۔

کتنے عرصے سے وہ بہانہ تلاش کر رہی تھی۔ بلقیس کے گھر جانے کا اور جیسے اچانک اس کا روان روان کھل اٹھا۔

ہاں ضرور۔

سچ بلقیس پہلے حیران ہوئی پھر خوشی سے بولی، اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پتا ہے کیا، ادا سجاول اس دن کہہ رہا تھا۔ وڈیری زیمل تو پاگل لگتی ہے۔

کیا۔۔۔۔۔۔ سجاول نے کہا۔ اس کا دل سینے میں دھک دھک کرنے لگا لمبی پلکیں لرز کر رہ گئیں۔

بلقیس سادگی سے کہہ رہی تھی۔ میں اس سے لڑ پڑی، میں نے کہا لو اس نے بھلا کیا

پاگلوں والی حرکت کی ہے پاگل ایسے ہوتے ہیں، تو۔۔۔۔بولا ایسے ہی تو ہوتے ہیں۔

زیمل جھٹ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔اسے لگا جیسے بلقیس نے یہ باتیں کہ کر دل کے ساز پر مضراب مار دیا ہو جس سے ہر تار جھنجھنا اٹھا ہو۔کوئی انوکھا گیت چھڑ گیا ہو۔

اس کا چہرہ لال ہو گیا۔

(جذبوں کو چھپا چھپا کر جینا بھی کتنا مشکل کام ہے، احساسات پر بند باندھنا ہزار طوفانوں کی موجودگی میں اور بھی مشکل۔)

بلقیس، میں واقعی پاگل ہوں۔اس نے میرا پاگل پن دیکھا ہو گا تب ہی کہا نا

پتلے پتلے ہونٹوں کے درمیان بڑی پیاری مسکراہٹ تھی۔جس کا مفہوم بلقیس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

اونہہ، چھوڑو وہ تو یوں ہی چھیڑ رہا تھا تم کوئی پاگل تھوڑی ہو۔اسے بلقیس کی اس وضاحت اور تسلی کی ضرورت کہاں تھی۔اسکا دل تو انوکھی لے پر دھڑکے جا رہا تھا۔

یہ انکشاف جیسے اسے بڑا ہی خوبصورت محسوس ہوا تھا وہ بے مقصد مسکراتی رہی۔

اماں کی خوب منتیں کر کے بلقیس کے گھر جانے کی اجازت حاصل کی اس میں زیادہ ہاتھ زینت کا تھا جو تیسری اور فی الحال چہیتی بیوی تھی، وڈیرہ حق نواز کے سامنے اس معاملے میں اس کی چل ہی گئی۔

زیمل تو کھل اٹھی۔مگر جانے کیوں بڑی اماں کا چہرہ بجھ گیا۔شاید اندر کہیں اپنی ذات

کے بے معنی ہونے کا دکھ امنڈا اور پھر اندر ہی کہیں گم ہو گیا تھا۔

وہ بھاگل کے ساتھ ئی تھی مگر بھاگل کو اس نے بلقیس کے گھر کے باہر ہی سے واپس حویلی بھیج دیا یہ کہہ کر کہ بچل کو کہہ دینا وہ ایک گھنٹہ بعد مجھے گاڑی میں کر لے جائے۔

دروازہ سجاول نے کھولا تو اسے دیکھ کر دیواروں کی مانند گنگ رہ گیا۔ سیاہ دھاگے اور شیشوں کے کام والی بڑی سی چادر میں وہ پر نور مسکراتے معصوم چہرہ کے ساتھ بے حد نزدیک تھی۔

دوسری طرف بھی کچھ ایسا ہی حیرت کا عالم تھا۔ مگر یہ عالم مدہوشی شرم و حیا کے باعث لمحہ بھر ہی رہا دوسرے لمحے چوڑیاں چھنکیں تو وہ ہوش میں کر جلدی سے پلٹ کر اندر چلا گیا بلقیس اسے دیکھ کر سبزی کاٹتے چھوڑ کر بھاگ کر ئی۔

ہائے اماں دیکھ تو زیمل وڈیری ئی ہے ہمارے گھر۔

یہ کیا دیوانگی ہے بلقیس اس نے اندر بلقیس کے ساتھ قدم رکھا تو دیوار کے پاس سے اس کی بھاری ناگواری سے بھری واز ابھری۔

کوئی اتنی اہم شخصیت تو نہیں گئی گھر میں، کہ اتنی خوش ہو رہی ہے وہ بھی انسان ہی ہیں تمہارے میرے جیسی۔ وہ کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ مگر لفظوں کے نشتر اور لہجے کی کاٹ زیمل حق نواز کی پور پور میں اتر گئی۔ اس کا چہرہ احساس تذلیل سے لال ہو گیا۔ بلقیس الگ اپنی جگہ خفیف سی ہو گئی اسے یقین نہیں تھا کہ اسکا بھائی یہ رویہ اختیار کرے گا۔

چار کتابیں پڑھ کر اسکا دماغ خراب ہو گیا ہے ادا کا تو بلقیس، دھیرے سے بڑبڑائی پھر دروازے سے دو چار قدم اندر ہی ساکت ہو جانے والی زیمل کا ہاتھ تھام کر بولی۔

تم برا نہ ماننا ادی یہ تو۔

نہیں برا تو ان باتوں کا مانا جاتا ہے بلقیس جو غلط ہوں، اس نے کچھ غلط تو نہیں کہا۔

ہے وہ خود کو سنبھال چکی تھی اور خوش دلی سے ہنس دی۔

بے شک اس کا رویہ ناشائستہ تھا اور لہجہ تلخ، اس سے قطع نظر اس کی یہ باتیں یہ نظریات اسے پسند تھی عاجزی سے جھکنے والے، سینے پر ہاتھ باندھ کر منمنانے والے انسان اسے کب اچھے لگتے تھے اس کے چہرے پر خفگی کا کوئی تاثر نہ دیکھ کر بلقیس کو تسلی ہوئی وہ اسے لئے اپنے کمرے میں چلی ئی۔

اماں گوٹھ کے وڈیرے کی بیٹی کو اپنے نگن میں دیکھ کر بدحواس سی ہو کر چارپائی بچھانے لگیں۔

بسم اللہ، بسم اللہ، ج تو ہمارا نگن چمک گیا ڈ ڈ۔ انہوں نے جلدی میں چارپائی پر اپنی اوڑھنی ہی بچھا دی۔

سیدھے سادے معصوم لوگوں کا اپنائیت بھرا یہ انداز اس کا دل گداز کر گیا۔ وہ بجائے چارپائی پر بیٹھنے کے اماں کے قریب ئی ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

میں بھی بلقیس کی طرح ہی ہوں، مجھ سے غیریت نہ برتیے۔ اس کی واز بھاری ہو گئی

پھر وہ زور سے ہنس دی۔

میں تو بلقیس کی بات پکی ہونے کی مٹھائی کھانے ئی ہوں۔

ہاں، ہاں کیوں نہیں۔اماں اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر چائے پانی کا انتظام کرنے کمرے سے چلی گئیں وہ اور بلقیس ایک چارپائی پر بیٹھ کر بے تکلفی سے باتیں کرنے لگیں۔مگر اس بے تکلفی میں بلقیس کے انداز میں ایک احتیاط تھی ایک احترام تھا کہ بہر حال وہ ایک وڈیری تھی۔

سجاول، حویلی کے اندر بڑی گھٹن، بڑا حبس ہے، اندر رہنے والوں کے لیئے کوئی در، کوئی دریچہ کھلی فضا میں نہیں کھلتا۔عابدہ حق نواز کے جملوں کی بازگشت سجاول کے ذہن میں ابھری۔ وہاں بھی وہ عجیب سے احساس کا شکار ہو رہا تھا۔

بلقیس کی کسی بات پر وہ زور سے ہنسی تھی۔کھلے کھلے شفاف چہرے پر ہنسی کی یہ چاندی بیحد بھلی معلوم ہو رہی تھی اتنی کھنکتی اور زاد ہنسی تھی۔سجاول سومرو کے پورے وجود میں ایک سرمستی سی دوڑ گئی۔وہ اچانک صحن میں چلا یا اسے دیکھ کر اس کی ہنسی یوں بند ہو گئی جیسے روشنی کے بشار کے سامنے کسی نے دیوار کھڑی کر دی ہو، جیسے نغمہ ساز کا گلا گھونٹ دیا گیا ہو۔

اس کے نازک ہونٹ پس میں جڑ گئے اور نظریں سجاول کے نکھرے وجود سے ہو کر جھک گئیں جب کہ بلقیس اس کی موجودگی سے بیخبر کہہ رہی تھی۔

تم نے ادا سجاول کی باتوں کا برا تو نہیں مانا تھا نا، پتا نہیں اسے حویلی سے کیا پرخاش ہے۔

بہت خفا رہتا ہے وہ رئیس لوگوں سے

بلقیس اس کے دل کی غیر معمولی دھڑکن سے بھی بے نیاز تھی۔

شاید اسی لیے وہ تمہیں دیکھ کر یوں غصے میں گیا، ورنہ بھلا تم سے اس کی کیا دشمنی۔

نہیں بلقیس مجھے تو خوشی ہے کہ دشمنی کا ہی سہی اس نے حویلی والوں سے کوئی رشتہ تو جوڑا۔

وہ پلکیں جھپکا کر بیاختیار بول گئی۔ بلقیس نے حیرت سے اس کی جھکی جھکی لرزتی پلکوں کی گھنی باڑھ کو دیکھا، پھر سجاول کی موجودگی محسوس کر کے پلٹی، اور جیسے بہت کچھ سمجھ گئی۔

وڈے لوگوں سے دشمنی مول لے کر ہم چھوٹے لوگوں کا نقصان ہوتا ہے، قا اور غلام کا رشتہ کافی نہیں ہے کیا۔

وہ استہزائیہ انداز میں ہنستا ہوا ان دونوں کی طرف گیا بڑا طنزیہ لہجہ تھا۔

ہم سے مراد میں خود ہرگز نہیں ہوں، بلکہ یہ گوٹھ والے ہیں جن کو سیڑھی بنا کر ہی وہ اپنی انانیت کی تسکین کرتے ہیں اگر یہ سیڑھی ہٹ گئی تو، وہ بھی زمین پر ہوں گے، مگر۔۔۔۔۔وہ لمحہ بھر کو رکا۔ چہرے پر پتھریلا پن سمٹ یا۔

مگر المیہ تو یہی ہے کہ گوٹھ والے اپنی ہی طاقت سے بیخبر ہیں اور میرا مقصد ان میں صرف اور صرف یہی شعور بیدار کرنا ہے، کہ قا اے وقت جنم لیتے ہیں جب انہیں کوئی قا کہنے والا اور سمجھنے والا ہو، کوئی پیدائشی غلام نہیں ہوتا نہ ہی کوئی پیدائشی قا ہوتا ہے، ہر شخص اپنی اپنی سوچوں کے مطابق خود کو اپنے رشتوں، سانچوں اور طبقوں میں ڈھال لیتا ہے۔

ادا بلقیس نے کچھ کہنا چاہا کہ زیمل نے اسے روک دیا۔ اور اپنی جگہ سے ہٹ کر سجاول کے سامنے گئی۔

میں جانتی ہوں، تم یہ باتیں بابا سائیں کے سامنے بھی کہنے کی جرات رکھتے ہو مگر، خدا کے واسطے ان کے سامنے بھی نہ کہنا، ایک عمر سے قا کہلوانے والے اتنی جرات برداشت نہیں کر سکیں گے، اور کوئی بڑا نقصان تمہاری جھولی میں نہ گرے، میں نہیں چاہتی کہ تمہیں کوئی گزند۔۔۔۔اس کی واز بھر گئی۔ دراز پلکیں لرز کر نکھوں پر یوں جھک گئیں جیسے کسی چشمے پر بید مجنوں کی شاخیں، سجاول دم سادھے حیرت اور بے یقینی سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ ان لرزتی پلکوں کے سائے میں اس لمحے میں کیا کچھ نہ تھا۔

وہ کوئی سادہ لوح یا نو عمر بہر حال نہیں تھا کہ وہ رنگ نہ پہچانتا، محبت کی روشنی کو نہ پہچان پاتا جس میں دل کے ہفت رنگ جذبے یوں یکجا ہو جاتے ہیں جیسے سمان پر شفق رنگ بھر جاتے ہیں۔ اس کا دل سینے کی چار دیواری میں کسی انقلاب سے دوچار ہونے لگا۔

خود کو مضبوط اور نا قابل تسخیر سمجھنے والا سجاول اس معصوم صورت سے تسخیر ہو گیا تھا۔ اسے لگا زیمل حق نواز نے اس کے دل کے ساز پر ہاتھ رکھ دیا ہو، اور ایک خوبصوت موسیقی بج اٹھی ہو۔ جس کے لے میں وہ خود کر بہتا ہوا محسوس کرنے لگا تھا۔

میں چلوں گی بلقیس۔ وہ نظریں اٹھانے سے گریز کر رہی تھی۔

سجاول سومرو کی۔۔۔۔ نکھوں میں کچھ ایسی گہرائی اور خوبصورتی ہویدا تھی کہ ان میں

ڈوت جانے کا کھو جانے کا خوف ابھر رہا تھا۔

وہ ڈھلکتی چادر سر پر ڈال کر جانے کو پلٹی۔ مگر دوسرے لمحے اس کی چوڑیوں سے بجی نرم و نازک کلائی اس کی مضبوط ہتھیلی میں تھی۔

بات سنو۔ جہاں اس کا دل زور سے ڈھڑکا، وہیں بلقیس نکھیں پھاڑے اپنے ادا کی اس جرات پر حیران و پریشان نظر نے لگی۔ اور پھر گھبرا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ زیمل کا چہرہ اس کی قربت کی پیش سے گرم ہو رہا تھا۔

زیمل حق نواز اوپر سے نیچے اترنا جتنا سان دیکھائی دیتا ہے، نیچے سے اوپر چڑھنا اتنا ہی مشکل، تم مجھ تک تو سکتی ہو، مگر میرا اوپر چڑھنا نا ممکن ہے۔

حیرت ہے، میں تو تمہیں بہت بہادر اور دلیر سمجھ رہی تھی۔ وہ ہستگی سے اس کی گرفت سے کلائی چھڑا کر دل کو سنبھالتے ہوئے ہولے سے ہنسی۔ اس کا لہجہ ٹوٹا ہوا اور استہزائیہ تھا سجاول ہونٹ بھینچ کر چند ثانیے اسے دیکھتا رہا۔

وہ دونوں اس لمحے اس بات سے بے نیاز تھے کہ یہاں حیرتوں کے سمندر میں غوطہ زن بلقیس بھی کھڑی ہے۔

جب حویلی کی ایک نازک لڑکی اتنی جرات مند ہو سکتی ہے، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ۔۔۔۔ سجاول علی شاہ بزدل ہو مگر۔۔۔۔ وہ ایک قدم اس کی جانب بڑھا اس کی سمت ذرا سا جھکا، اور اس کی کھلی کھلی سمندر صفت انکھوں میں جھانکتا ہوا بولا۔

یہ ایقان بھی تو ہو، کہ پھر وہ خالی ہاتھ نہیں رہے گا صرف تشنگی اس کے حصے میں نہیں گی۔

اس کے لہجے میں مہکتے جذبوں کی گمبھیرتا تھی وہ جذبے جو زیمل حق نواز کی رگوں میں اتر کر خون میں گردش کرنے لگے تھے۔

اس نے ذرا سی پلکیں اوپر اٹھائیں پھر رخ موڑ لیا۔ یہ کوئی سودا تو نہیں ہے سجاول علی شاہ، منزل کا یقین تو مسافت طے کرنے کے بعد ہی ملے گا وہ رکی نہیں اور سرعت سے باہر نکل گئی جہاں گاڑی اس کی منتظر تھی۔

ہاں زیمل حق نواز، منزل کبھی خود چل کر نہیں تی اس کے لیے سفر ضروری نہیں ہے۔ اس کے لبوں کی تراش میں دلفریب مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ پلٹا مگر بلقیس پر نگاہ پڑی تو خجل سا ہو کر رہ گیا۔

دیکھا ناں میں نے کہا تھا نا، تیری وڈیری، بالکل پاگل ہے۔

ہاں ادا تم بالکل ٹھیک کہتے ہو، وہ واقعی پاگل ہے۔ بلقیس دھیرے سے بڑبڑائی اور بڑے بڑے قدموں سے باہر کی طرف جاتے سجاول کو خوشی، خوف اور حیرت کے ملے جلے احساسات کے ساتھ دیکھتی رہ گئی۔ اس انکشاف نے جہاں اسے حیران کیا تھا مسرت سے گدگدایا بھی تھا وہیں خوف کا ناگ بھی سر اٹھا کر پھنکارنے لگا تھا۔

یہ جوڑ، کیا ممکن ہو سکتا ہے وہ دونوں اس راہ میں قدم رکھ کر سود و زیاں سے یکسر بےنیاز ہو چکے تھے مگر۔۔۔۔ بلقیس ساری رات کروٹ پر کروٹ بدل کر اچھے اور برے خیالات میں

جکڑی رہی۔

میں تیرے سنگ کیسے چلوں سجنا

تو سمندر ہے میں ساحلوں کی ہوا

تو بہاروں کی خوشبو گھنی چھاؤں ہے، میں ستارا تیرا

زندگی کی ضمانت تیرا نام ہے، تو سہارا میرا

میں نے ساری خدائی میں تجھ کو چنا

تو سمندر ہے میں ساحلوں کی ہوا

تم چلو تو ستارے بھی چلنے لگے، نسوؤں کی طرح

خواب ہی خواب نکھوں میں جلنے لگے رزو کی طرح

تیری منزل بنے میرا ہر راستہ

وہ بال بکھرائے انہیں دھیرے دھیرے سلجھاتی پھر بگاڑ دیتی پھر سلجھانے لگتی، ساتھ ساتھ گنگنا بھی رہی تھی۔ ادی عابدہ، دروازے کی چوکھٹ پکڑے خاصی دیر سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ پھر اندر اس کے پاس گئیں۔

کیا بات ہے، ج بہت خوش دکھائی دے رہی ہو۔ انہوں نے اس کے سراپے پر ایک نگاہ ڈالی۔

ہوں وہ پلٹ کر مسکرائی پھر برش سنگھار میز پر رکھ کر بالوں کو پیچھے جھٹک کر دریچے سے

باہر جھانکنے لگی۔

وہی لان تھا، وہی فضا تھی، وہی رنگ تھا آسمان کا، مگر اسے ہر شے میں آج نغمگی اور تازگی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دریچے سے لگ کر مسکرانے لگی۔

خوشی کا احساس تو دل کی زمین سے پھوٹتا ہے ادی زمین دل شاداب اور سیراب ہو تو پھر وہاں سے خوشیوں کی کونپلیں ہی پھوٹتی ہیں۔

عابدہ دم سادھے اس کی پشت پر بکھرے بالوں کے گچھوں کو تکتی رہ گئیں جو ہوا کے تھپیڑوں سے اٹکھیلیاں کرتے وہ بھی مسرور دکھائی دے رہے تھے۔

زیمل کو کیسی خوشی مل گئی اس بند اور حبس زدہ حویلی میں کہ۔۔۔۔اس کا لہجہ بھی مہک رہا ہے۔ اچانک ان کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ انہیں اس کی خوشی کا جواز فوراً ہی سوجھ گیا۔

سجاول سے تیری ملاقات ہوئی ہے کیا۔ وہ دھیرے سے پوچھنے لگی اس کا دل دھک سے رہ گیا اس نے پلٹنا چاہا مگر پلٹ نہ سکی۔ عابدہ کا شفیق ہاتھ شانے پر آیا تو اس کا دل دھڑکنے لگا۔

کہیں یہ خوشی عارضی نہ ہو زیمے، یہ رنگ کچے نہ ہوں اب تو خوف آتا ہے مجھے خوشی کی لہر سے بھی کہ کہیں یہ بھی ڈبو ہی نہ دے۔ وہ جھٹکے سے پلٹی۔ ادی عابدہ اسے بہت محبت سے دیکھ رہی تھیں۔ مگر آنکھوں میں تشویش جھلک رہی تھی۔ وہ بے اختیار ان کے مہربان شانے پر جھک گئی۔

تجھے کیسے خبر ہوئی ادی کہ میری خوشیوں کا راستہ سجاول کی طرف جاتا ہے۔ اس کے لہجے

میں حیرت بھی تھی اور شرم بھی، عابدہ ہولے سے ہنس دیں اور دریچے کا پردہ پورا کھولنے لگیں

بس خبر ہوگئی انہوں نے باہر پھیلتے اندھیرے میں نگاہیں گاڑ دیں۔

(میں محبت کے لمس سے نا شنا رہی ہوں تو کیا ہوا، محبت کے رنگ تو جانتی ہوں، اس خوشبو کو پایا نہیں تو کیا ہوا، پہچان تو ہے۔ ہنسنا بھول گئی ہوں پر، ہنسی کے سارے سر جانتی تو ہوں۔)

ارے واہ ایسے کیسے خبر ہوگئی۔ وہ سر اٹھا کر ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔

تیرے تو انگ انگ سے پتا چلتا ہے، بے وقوف کیا جانتی نہیں میں کہ بلقیس سے ملنے، اس کے گھر جانے کے کو تو اتنی بیتاب کیوں ہوتی ہے، اور اب بلقیس کی سگائی میں جانے کیلئے زینت اماں کی اتنی منتیں کر رہی ہے کہ بابا سائیں تجھے بھیج دیں۔ عابدہ ہنس کر اس کی نکھوں میں جھانکتے ہوئے بولیں تو وہ شرما کر ان سے دور ہٹ گئی اور بیڈ کے کنارے بیٹھ گئی۔

وہ بہت سٹھا ہے ادی تم ملو گی، اسے دیکھو گی، اس کی باتیں سنو گی تو تمہیں بھی اس سے۔

۔۔۔میں سچ کہتی ہوں ادی۔

ہاں بڑا اکڑیل لڑکا ہے مگر، مگر میں ڈرتی ہوں، یہ سب جس طرح تم یا میں سوچ سکتے ہیں کیا، ایسا ہونا ممکن ہے۔ عابدہ اس کے چہرے پر پھیلے رنگ اور نکھوں میں چھائے سجاول کے عکس کو دیکھ کر خوفزدہ ہو رہی تھیں۔

میں کچھ نہیں جانتی ادی، بس مجھے یوں لگتا ہے میرے حصے کی ساری خوشیاں سجاول کی

مٹھی میں ہیں۔

مگر تیری تقدیر بابا سائیں کی مٹھی میں ہے عابدہ حق نواز کے لبوں پر مجروح مسکراہٹ بکھر کر ٹوٹ گئی وہ الماری سے اپنا جوڑا نکالنے لگیں پھر کچھ سوچ کر پلٹ کر بولیں۔

وہ کیا کہتا ہے کیا اس میں اتنی جرات ہے کہ وہ اس حویلی میں، تیری تقدیر میں انقلاب لا سکے گا۔

زیمل نے انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر بہن کا چہرہ دیکھا خود بخود دھیمی مسکراہٹ لبوں کی تراش میں سمٹ ئی۔ بھلا سجاول سومرو کی دلیری اس کی جرات سے کون واقف نہیں تھا مگر اسے یوں بیجابانہ اس کی تعریف کرتے ہوئے اس کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے ادی سے شرم نے لگی۔

اگر وہ دلیری اور جرات مند ہے، تب بھی کیا وہ تقدیر سے لڑ سکے گا۔ عابدہ حق نواز کے دل پر اداسی اور مایوسی کا دل شکن اندھیرا گہرا ہو گیا۔ انہیں زیمل کی یہ خوشی پانی کے بلبلے کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔

تم وڈی بزدل ہو ادی۔ وہ مسکرا کر ان کے نزدیک چلی ئی جہاں بابا سائیں سے خوفزدہ رہیں، وہیں اپنی تقدیر سے بھی نا امید رہیں۔ ہم کیسے سوچ سکتے لیں کہ ہماری تقدیریں اللہ نے ہمارے باپ بھائیوں کے ہاتھوں میں تھما دی ہیں، انہیں ادی، تمہیں تمہارا گمان لے ڈوبا مگر میں؟؟؟ گمان نہیں ہوں، کہتے ہیں اللہ ہمارے گمان کے ساتھ ہے، بیشک بہت جرات مند بھی

تقدیروں کے دھارے نہیں موڑ سکتا، مگر یہ بھی تو کہتے ہیں نہ کہ تقدیر ہمیشہ بہادروں کا ساتھ دیتی ہے۔

اور سچ تو یہ ہے ادی کہ محبت ان تمام باتوں سے الگ ہے یہ پوں پ گھنگھور بادل کی مانند زمین دل پر برس جاتی ہے میں بھی جل تھل ہو گئی ہوں، مجھے اب نہ بہہ جانے کا خوف ہے، نہ ساحل کی تمنا وہ جذبوں سے پر واز میں بولی

عابدہ حق نواز جذبوں کی شدت سے پاگل لڑکی کو دیکھتی رہ گئی۔

تو کیا وہ اس راستے پر پہنچ چکی ہے جہاں سفاک حقیقت چھپ جاتی ہے اور خوش گمانیوں کی چادر تن جاتی ہے جہاں امیدوں کا جہاں باد ہو جاتا ہے اور سب کچھ پا لینے کی خواہش یا پار لگا دیتی ہے یا ڈبو دیتی ہے۔

خدا نہ کرے کہ میری زیمل غم کے سمندر میں ڈوب جائے۔ ان کا رواں رواں زیمل کے لیے دعا گو ہو گیا۔

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| یٹین | منجو | چلڑو | پاٹی | مہ |
| کیٹن | پیو | چلڑو | پاٹی | مہ |

بلقیس کی ماما اور چاچا کی بیٹیاں بڑی خوبصورت لڈی ڈالے ہوئے تھیں۔ ج بلقیس کی منگنی تھی وہ کڑھائی اور شیشوں سے جگمگ کرتے اور بڑے سے دوپٹے میں جھلملاتے زیورات کے ہمراہ بڑی پیاری لگ رہی تھیں۔

ماسی سکینہ اور امداد علی کے چھوٹے سے گھر میں ج خوب رونقیں تھیں۔ زیمل حق نواز کے لیے یہ کھلکھلاہٹیں یہ رونقیں بڑی دلچسپی لیے ہوئے تھیں۔ وہ بابا سائیں کی خوب منتیں کر کے اور چھوٹے رئیس سلطان شاہ کی حمایت پر بلقیس کے گھر ئی تھی۔ اب لمحے لمحے سے خوشی کشید کر رہی تھی۔

وہ اپنے دامن دل میں انمول یادوں کا اضافہ کرنا چاہتی تھی۔ اسے یہ خوش سند لمحے بھلا حویلی میں کہاں ملنے تھے۔

بہت تھک گئی ہو کیا وہ ہجوم سے نکل کر جب ایک خالی کمرے میں پڑی چارپائی پر لیٹی تو بلقیس اس کے پاس چلی ئی۔

وہ ابھی تک ان ہی کپڑوں میں تھی رسم ہو چکی تھی۔ ٹیلیہ (چاند کا نشان اس کا مطلب ہوتا ہے کہ اس لڑکی کا رشتہ کسی سے طے ہو گیا ہے) اس کی صبیح پیشانی پر بھنوؤں کے درمیان چمک رہا تھا۔

بھلا خوشیوں سے جھولی بھرتے ہوئے بھی کوئی تھکتا ہے۔ وہ ہنس دی۔

لاں تمہاری باتیں تم میرے سر سے گزر جاتی ہیں، تم نے کھانا بھی نہیں کھایا میں ابھی لے کر تی ہوں۔ بلقیس نے اپنا جگمگاتا گاج (دوپٹہ) اتار کر مسہری پر رکھا اور سادی چادر اٹھا کر اوڑھ لی تم رام سے بیٹھو کھانا وانا بھی کھا لوں گی، دلہن یہاں وہاں چک پھیریاں کھائے گی، سسرال والے دیکھیں گے تو کیا کہیں گے کہ ہماری دلہن تو پے میں نہیں نے مارے خوش

کے

کوئی نہیں، وہ بھلا کہنے والے کون ہیں، ویسے وہ جا بھی چکے ہیں۔ بلقیس ہنستی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ وہ مسہری پر بیٹھی رہی پر تھکن اور ایک طرح کی سرشاری سے اس کی نکھیں از خود بند ہو رہی تھیں۔ اس چھوٹے سے گھر میں بیآرام چارپائی پر کتنا سکون مل رہا تھا۔

اس نے کھڑکی سے تی روشنی سے بچنے کے لیے منہ پر از خود چادر ڈال لی اور بلقیس اور اس کے گھر کے لوگوں کے بارے میں سوچنے لگی۔

اوئے بلی، تے ہی پڑ کر سو گئی۔ کسی نے زور سے اس کے منہ سے چادر نما دوپٹہ کھینچ لیا۔ وہ ہڑ بڑ کر اٹھ بیٹھی یہ غیر اخلاقی حرکت کرنے والا سجاول تھا۔ وہ بھی بلقیس کے بجائے زیمل حق نواز کو یوں اپنے کمرے میں اپنی مسہری پر سوتا دیکھ کر سٹپٹا گیا۔

اوہ، سوری میں سمجھا بلقیس ہو گی۔ وہ مسہری سے دو قدم پیچھے ہٹ گیا مگر نظریں باوجود کوشش کے نہ پھیر سکا۔ وہ پیرٹ گرین کڑاھی والے کرتے اور کڑھائی کے ہم رنگ میں بڑی نکھری نکھری دکھائی دے رہی تھی۔ چمکتی جھیلوں جیسی نکھوں اور مہکتے رخساروں پر سبز رنگ ایک بہار دکھا رہا تھا ج پہلی بار اپنے دراز بالوں کر چوٹی کی بجائے سبز رومال سے جکڑ رکھا تھا۔ کانوں میں چھوٹی چھوٹی جھمکیاں لٹک رہی تھیں۔ جو کھڑکی سے تی روشنی میں جگر جگر کرتیں چہرے پر نکھار لا رہی تھیں۔

سجاول سومرو کو لگا جیسے اس کا پورا کمرہ مہک اٹھا ہو۔ موسم نے یہیں ڈیرہ ڈال لیا ہو۔

سوری تم مجھے کہنا چاہیئے کہ بن پوچھے تمہارے کمرے میں ڈیرہ ڈال لیا ہے وہ اب بظاہر خود کو سنبھال چکی تھی۔ مگر دل کو اب تک نہ سنبھال پائی تھی۔ جو پاگل ہو رہا تھا۔

بن پوچھے دل میں بھی تو ڈیرہ جما لیا ہے، اس پر معذرت نہیں کرو گی، پوری خالی زمین پر قبضہ کیا ہے۔ سجاول نے یہ کہتے ہوئے اس کی شرم سے اٹھتی گرتی پلکوں کا کھیل بیحد دلچسپی سے دیکھا۔ اس کے عارض کو یوں یکدم دہکتے دیکھنا اس کے لیے بڑا دلچسپ تجربہ تھا دل کو گدگدانے والا جذبوں میں ہیجان پیدا کرنے والا، مگر وہ بیحد مضبوط اعصاب کا تھا کوئی سطحی حرکت کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

سجاول علی شاہ حساب تو تم نے بھی پورا لے لیا۔

وہ مسہری سے اٹھ کر ذرا سا ہنسی پھر دوپٹہ سر پر ڈال لیا اس طرح کہ اس کا سرخ دہکتا جذبوں سے پر چہرہ ڈھا چھپ گیا۔

ارے بیٹھو نا دیکھا میرا کمرہ وہ راہ میں ئی کرسی ایک طرف ہٹا کر کمرے پر طائرانہ نگاہ دوڑاتے ہوئے اس سے پوچھنے لگا۔

بس یہی ہے میرا دولت کدہ دیکھ لو اور اب بھی وقت ہے سوچ لو، وڈیری حق نواز کے سمان سے اتر کر زمین پر نا پڑے گا، تمہارے لیے یہ سراسر خسارے کا سودا ہے۔ اس کا لہجہ بڑا سنجیدہ اور لیے دیئے سا ہو گیا۔

زیمل نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر اس کی پلکیں اس کے سراپے پر ٹھہر گئیں۔ سیاہ شلوار سوٹ میں وہ اونچا لمبا، چہرے کی خوبصورتی میں سنجیدگی سمیٹے، اسے اپنے دل میں اترتا محسوس ہو رہا تھا۔

اتنی بہت سی کتابیں پڑھ کر تم شاید لطیف جذبوں کو، چاہے جانے کے فخر کی دولت کو، فضول خیال کرنے لگے ہو، محبت کوئی کاروبار تو نہیں ہے سجاول شاہ اگر سودا بھی ہے تو دل کا، جس میں نہ خسارے کا حساب لگایا جاتا ہے نہ منافع کا، اکنامکس کا کوئی اصول نہیں ہے۔ اس کے لہجے میں دبا دبا احتجاج تھا ہلکی خفگی تھی سجاول نے اس کا دل ہی توڑ ڈالا تھا۔

کیا اب بھی وہ اس کے جذبوں کو حویلی کے بڑے سردار کی ذہنی سوچ سے تول رہا تھا۔ یہ تو ایک جواں سال لڑکی کے نوخیز جذبے تھے۔ جو مثل مہتاب تھے اور بھلا ابھرتے مہتاب کا راستہ کون روک سکا ہے۔ یہ سجاول اسے نفع نقصان سے کیونکر ڈرانے کی کوشش کر رہا ہے۔

وہ جانے لگی تو اس نے بڑی نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اس کا رخ اپنی جانب کر لیا، اس نے پلکیں اوپر اٹھائیں وہ بڑی لگاوٹ اور جذبوں سے پر نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

خفا ہو گئیں

نہیں اس نے پلکوں کو منوں بوجھ کے ساتھ رخساروں پر جھکا لیا۔

(پتا نہیں اس شخص کو کیسا ہنر آتا ہے خفا کر کے منا لیتا ہے یا پھر اسے ہی خفا ہونا نہیں

تا) بہت اچھی لگ رہی ہو، یقین کرو، تمہیں یہاں دیکھ کر میرا دل بہت خوش ہے۔

اس کے لہجے میں کوئی جھوٹ، کوئی بناوٹ نہیں تھی وہ بے حد سادگی اور محبت سے کہہ رہا تھا

اس کے رخساروں پر لہو رنگ چھلک یا۔

محبوب کی اس تعریف نے اس کے دل میں پھول کھلا دیئے۔ اس نے خود بھی ئینے میں اپنا سراپا دیکھا تھا اسے اچھا بھی لگا تھا ادی عابدہ اور بلقیس نے بھی اس کی بہت تعریف کی تھی۔ مگر سجاول کے منہ سے، اپنی تعریف سن کر اس کا دل اور طرح سے سرشار ہوا تھا۔ اسے پہلی بار معلوم ہوا تھا کہ محبوب کی ذرا کی تعریف ذرا سی توجہ دل میں کیسے کیسے پھول کھلا دیتی ہے کتنی خوشیاں بھر دیتی ہے۔ کیسے رنگ بھر دیتی ہے۔

اچانک کھڑ پڑ کی واز پر وہ سنبھل گئی۔

؟؟؟ نازیمل وہ اسے دروازے کی جانب لپکتا دیکھ کر بے تابی سے پکار بیٹھا۔

نہیں بہت دیر ہو جائے گی حویلی سے گاڑی بھی تی ہو گی بلکہ ادا سجل نے گاڑی تو شاید یہاں بھیں لا رکھی ہے، تم شہر کب جا رہے ہو وہ رک کر کچھ سوچ کر پوچھنے لگی۔

کیوں کوئی فرمائش کرنی ہے وہ مسکرایا وہ بھی ہنس دی بڑی مطمئن ہنسی تھی۔

اب کسی چیز کی تمنا ہی نہیں رہی، بن مانگے ہی سب کچھ مل گیا ہے۔ اس نے یہ کہتے ہوئے بلقیس کو تے دیکھا تو جھپاکے سے کمرے سے نکل گئی۔ سجاول مسکرا دیا۔ مگر دوسرے پل اس کی مسکراہٹ کو ہو گئی۔

سنجدگی چہرے پر سمٹ ئی وہ مسہری پر بیٹھ گیا۔

پتانہیں وہ زیمل حق نواز کی ان مسکراہٹوں کو سدابہار رکھ سکے گا یا نہیں، کہیں اس کے حوصلے کی چٹانیں چیخ نہ جائیں۔اس کے ذہن میں سوچوں کا ایک جہاں باد ہو گیا۔وہ اٹھ کر ٹہلتا ہوا کھڑکی تک یا اور پردہ ہٹا کر باہر دیکھا تو زیمل حق نواز پر نگاہ پڑی وہ حویلی کی مخصوص پجیرو کے پاس کھڑی تھی۔جس کو چلانے والا اس کا اپنا بھائی، وڈیرے کا ملازم سچل تھا۔اس کے لبوں پر مجروح مسکراہٹ بکھر کر ٹوٹ گئی۔وہ چاہتا تو زیمل حق نواز کے ساتھ یہ مختصر سفر کا ساتھی خود ہوتا، مگر اسے یہ گوارہ نہیں تھا وہ اس کے ہمراہ پورے استحقاق کے ساتھ چلنا چاہتا تھا سر جھکا کر مؤدب ہو کر نہیں، چاہے وہ سفر ایسی کسی پجیرو میں نہیں پیدل ہی سہی لیکن اس فخر کے ساتھ کہ زیمل حق نواز اس کے ساتھ چل رہی ہے وہ وڈیری زیمل کے ہمراہ نہیں۔

ادھر زیمل نے پجیرو میں بیٹھتے بیٹھتے الوداعی نگاہ اس کی کھلی کھڑکی پر ڈالی اور پھر حیا لودہ انداز میں سکڑ کر اندر گم ہو گئی، کھلی کھڑکی کے پردے بھی گرا لیے۔جیسے چاند بادل میں چھپ کر متلاشی نظروں کو ستائے۔

سچل ویو مرر سیٹ کرتے ہوئے اپنی جگہ دم بخود رہ گیا تھا۔اس نے اپنے گھر کی کھڑکی سے سجاول کو دیکھ لیا تھا اور اب وڈیری کی نگاہ کا اٹھنا، حیا سے مسکرانہ اس سے مخفی نہ نہیں تھا۔

بلقیس کی طرح اسے بھی کچھ خبر ہو چکی تھی، اور اس وقت سجاول کے چہرے سے نہ ہٹتی وڈیری کی صرف نکھیں ہی پورا سراپا ہی تشہیر بنا ہوا تھا۔اس کے دل پر عجیب سا

سناٹا اتر آیا۔ وہ حیران ہی نہیں پریشان بھی ہو رہا تھا کہ کہاں زمین کہاں آسمان۔

بہت رات ہوگئی ہے نا۔ اس نے گاڑی آگے بڑھائی تب وہ آہستگی سے بولی۔

جی سائیں بس لڑکے والوں نے زیادہ دیر کر دی کیا کریں ہم دھی والے ہیں، سائیں سب برداشت تو کرنا پڑے گا۔ بچل کے لہجے میں انکساری تھی۔

ہاں بہت انتظار کرایا لڑکے والوں نے۔ وہ پردہ ہٹا کر باہر اندھیرے میں دیکھنے لگی، ہو طرف ملگجا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ سنسان راستوں پر ان کی جیپ دوڑ رہی تھی۔ بالکل اچانک جیپ کے پہیوں کی گھڑ گھڑاہٹ سنائی دی پھر ایک ہلکی سی چیخ نے اسے چونکا دیا۔ یہ چیخ نسوانی تھی اور انتہائی بیبس اور بیحد مختصر۔

گڈی روکو بچل۔ اس کی نگاہیں دائیں طرف دیکھ رہی تھیں۔ گھنے درختوں کی جھنڈ کی طرف وہ جیپ اس کے بڑے رئیس مہران شاہ کی تھی جس میں وہ اپنے دو آدمیوں کے ساتھ بیٹھا تھا جب کا پیچھے آتی جیپ میں چار خطرناک قسم کے آدمی بیٹھے تھے۔

اس کی آنکھیں دھوکا نہیں کھا رہی تھیں، ان میں سے دو آدمیوں نے درخت کی طرف بھاگتی لڑکی کو کھینچ کر جیپ میں بٹھا لیا تھا، دوسرے لمحے لڑکی کی چیخیں ذرا سی گونج کر دم توڑ گئیں، یقیناً اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا گیا تھا، یا اسے بیہوش کر دیا گیا تھا، اس نے پھر مہران شاہ کو ہاتھ لہرا کر کچھ اشارہ کرتے دیکھا اور دیکھتے ہی دیکھتے دونوں جیپیں فرائے بھرنے لگیں۔

کتنے ہی لمحے اسے اپنی بصارتوں پر اعتبار نہیں آیا، لڑکی کی چیخ، اس کا لہراتا ہاتھ، شاخ

میں انکتا دوپٹہ، جیپ کی گھڑ گھڑاہٹ اداامبران شاہ کی ہنسی۔

سارے منظر ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوگئے اسے یکدم اپنا سانس گھٹتا ہوا محسوس ہوا، اس نے پتھرائی نکھیں کھڑکی سے ہٹا کر بچل کی طرف دیکھا جس کا چہرہ گاڑی کے اندر ہونے والی روشنی میں سفید دکھائی دے رہا تھا۔

یہ یہ سب کیا تھا بچل۔ وہ بامشکل بول پائی، اس کے حواس اب بھی قابو سے باہر تھے۔

یہ یہ تو اداامبران تھا نا۔ اس کی نکھوں یکدم جلنے لگیں۔

ایسا کرو بچل، یہ بجیرو ان راستوں پر لے جاؤ جہاں جیپ گئی ہے۔ اس کے لہجے میں یکدم طلاطم امنڈ یا، بچل لرز اٹھا۔

ن۔۔۔۔۔ نہیں نہیں سائیں یہ کیسے ہوسکتا ہے۔

کیوں، کیوں نہیں ہوسکتا۔ وہ چلائی سچ بتاؤ بچل یہ سب کیا تھا، اندھیرے میں کون سا کھیل کھیلا جا رہا ہے، وہ لڑکی کون تھی جس کی چیخوں کردبایا گیہ ہے۔

سائیں معافی مانگتا ہوں، پ کھڑکی کا پردہ گرالیں۔ بچل نے کہا تو اس نے بڑی زخمی نظروں سے اسے دیکھا، اس کے دل ودماغ میں ندھیاں چل رہی تھیں، دل اس روح فر انکشافات پر دھڑ دھڑ جل رہا تھا بچل نے چہرہ سیدھا کرلیا اور گاڑی اسٹارٹ کردی۔

مجھے ایسا لگ رہا ہے بچل جیسے یہ سب کچھ پہلی بار نہیں ہوا، ہوتا رہتا ہے، تمہارے چہرے سے لگ رہا ہے تم بارہا ایسے منظر دیکھے ہیں بولو ہے نایہی بات۔۔۔۔؟ وہ ذرا گے ئی اور

پیچھے سے سچل کے شانے کو جیسے نوچ بیٹھی۔ وڈیری کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ پ نے جو کچھ دیکھا ہے اسے خواب سمجھ کر بھول جا ئیں، کوئی فائدہ نہیں نے۔ اوف وہ پیچھے ہٹی، سیٹ کی پشت پر سر ٹکا کر جلتی نکھوں کو زور سے میچ لیا۔

یہ خواب نہیں تھا سچل سومرو، یہ سفاک حقیقت تھی جسے کبوتر کی طرح نکھیں بند کر کے جھٹلایا نہیں جا سکتا، یہ حویلی کے عزت دار رئیس زادے کی برہنہ فطرت تھی، جو اس دبیز اندھیرے میں اپنی تمام تر خوفناکی کی اور بدنیتی کے ساتھ نمایاں تھی وہ اس لمحے بھوکا بھیریا دکھائی دے رہا تھا، میرے خدا کون ہوسکتی ہے وہ لڑکی، کس باپ کی کس ماں کے جگر کا ٹکڑا ہوگی، کس گھر کی عزت ہوگی جسے روندا جا رہا ہے۔ وہ بے اختیار سسک اٹھی۔

ہم کمدار لوگ ہیں سائرن، نکھیں رکھتے ہوئے بھی اندھا رہنا پڑتا ہے۔ اس کی سسکیاں پجیرو کی فضا کر بوجھل کر رہی تھیں اور سچل کے دل کو بھی۔

ہونہہ بزدل ہو تم لوگ، اگر اس لڑکی کی جگہ بلقیس ہوتی پھر؟ سچل کا پیر زور سے بریک پر پڑا، اس کا چہرہ لال ہوگیا، مگر وہ پلٹا نہیں اسٹیرنگ پر دونوں ہاتھ مضبوطی سے جمائے رہا، پھر دوسرے پل ان نے جیسے اپنے اعصاب کر سنبھال لیا اور اگنیشن میں چابی گھما دی۔

تم مردوں کی یہ بے بسی ہی ج، یہ دن دکھا رہی ہے، ہونہہ تم بزدل ہو سچل سومرو، بہت بزدل اگر تمہاری جگہ سجاول ہوتا تو، میری اس بات پر میرا منہ طماچوں سے سرخ کر دیتا اور۔۔

۔۔ اس نے لب بھینچ کر مغموم پلکوں کو موند کر گویا سچل کے چہرے پر پھیلتی بے بسی اور بیچارگی

سے نگاہیں ہٹا لیں۔ اس کا دل ریت کی مانند بیٹھتا جا رہا تھا۔

حویلی پہنچ کر وہ سیدھی اپنی کمرے میں ئی اور بیڈ پر اوندھے منہ گر کر بلک بلک کر رو دی

اس کے ذہن کی سطح پر وہ بھیانک منظر کسی فلم کی طرح چلتا رہا۔

چھوتھیو ادی زیبے۔ ادی عابدہ اس پر جھک کر تشویش سے پوچھ رہی تھیں۔ وہ خاصی

رات کو کمرے میں ئیں تھیں۔ وہ سیدھی ہوئی تو عابدہ دہل گئیں اسکی سرخ سرخ متورم انکھیں

اور لال چہرہ انہیں دہلا گیا۔

ہائے ماں کیا ہوا تجھے؟

کچھ نہیں ادی، بس ج ایک مان ٹوٹ گیا ہے جسے سائبان سمجھ رہی تھی وہ تو بالکل کھوکھلا

درخت نکلا ادی۔ اس کی واز میں ایسی ٹوٹ پھوٹ تھی کہ عابدہ کا دل اندیشوں سے لرزنے

لگا، وہ اس کے قریب بیٹھ گئیں۔

کک۔۔۔۔۔ کیا ہوا میری جان کک۔۔۔۔۔ کہیں سجاول۔۔۔۔۔

نہیں۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور بکھرے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے لب کاٹتی اس اذیت کو نئے

سرے سے دل پر محسوس کرنے لگی۔

زیبے عابدہ نے اس کا شانہ جھنجھوڑ ڈالا، تب وہ اس سے لگ کر بچوں کی طرح رو دی، اور

تمام بات کہہ سنائی، عابدہ حق نواز کا ہاتھ اس کی پشت کو سہلاتے سہلاتے یکدم ٹھہر کر رک گیا،

ان کے چہرے پر پیلاہٹ پھیل گئی۔

کب؟

ج۔۔۔۔ ج بلقیس کے یہاں سے رہی تھی تب ادا کی جیپ دیکھی، اس کے پیچھے بھی اس کے دمیوں کی جیپ تھی اور انہوں نے۔۔۔۔ادی۔وہ اور شدت سے رونے لگی۔

عابدہ کے لبوں سے ایک گہری مضمحل سانس خارج ہوگئی، انہوں نے نرمی سے اس کے بال سہلاتے ہوئے اسے خود سے الگ کیا اور بیڈ سے کھڑی ہوگئیں۔کمرے میں چند ساینے گہرا سکوت رہا جسے وقفے وقفے سے صرف زیمل کی سسکیاں چیرتی رہیں۔

ایسی کتنی چیخیں رات کے اندھیروں میں ابھر کر دم توڑتی رہی ہیں اور نہ جانے کتنی دم توڑتی رہیں گی یہ کوئی پہلا واقعہ تو نہیں ہوا۔

دی عابدہ کی واز سناٹے کو چیرتی بڑی ہیبت اور یاسیت سے بھری، ابھری زیمل نے چونک کر سر اٹھایا اس کے ٹمکتے نسو پلکوں کی دیواروں پر ٹھر گئے۔کیا، کیا مطلب ادی۔

ہاں، اس حویلی میں اور دوسری حویلیوں میں ایسی کتنی بدنصیبوں کو روندا گیا ہے۔ادی عابدہ نے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے ایک گہری سانس کھینچی زیمل سناٹے میں رہ گئی۔

اس کا مطلب ہے تم بھی ادی سچل کی طرح سب جانتی ہو، یہ کھیل بہت پرانا ہے اس کی واز کپکپارہی تھی، عابدہ حق نواز کے لبوں پر ایک مسکراہٹ لہرا کر منجمد ہوگئی۔

ہاں، بہت پرانا، جب مس نے شعور کی سیڑھی پر قدم بھی نہیں رکھا تھا ایسی بہت سی چیخیں سماعت سے ٹکراتی تھیں۔

کیا ۔۔۔۔۔زیمل جھٹکے سے بیڈ سے کھڑی ہوگئی۔

اس وقت۔۔۔۔۔۔اس وقت ادی تب تو ادا مہران شاہ بچے۔۔۔۔۔۔اس نے الجھ کر ادی کا چہرہ دیکھا۔

ہاں مہران تو اس وقت جھولے میں ہوا کرتا تھا مگر بابا سائیں تو تھے نا۔

انہوں نے یہ کہہ کر نظریں فرش پر گاڑ دیں، زیمل کے چہرے پر پھیلتے تاثرات کو دیکھنے کا یارا نہ تھا وہ تحیر میز بےیقینی سے ادی کو دیکھ رہی تھی پھر جیسے گھبرا کر نگاہیں سامنے دیوار پر کرلیں اس کے دماغ میں دھماکے ہونے لگے اعصاب تند ہوا میں ئے پودوں کی طرح بکھرنے لگے تھے یکا یک اس کی نکھیں یوں جلنے لگیں جیسے عابدہ نے ان میں مرچیں ڈال دی ہوں، رونا چاہا مگر رو بھی نہ سکی، بس ذہن و دل میں امڈتے طوفان کا شور سنتی رہی، اس انکشاف نے اسے شل کر دیا تھا۔

تجھے کیا خبر چری لڑکی، ہم جنھیں گھنا سایہ سمجھ رہے ہیں وہ تو خزاں رسیدہ درخت ہیں ہم جنھیں اپنا فخر اپنا مان کہتے ہیں وہ تو خود ہمارے لیے ہنی زنجیریں ہیں گوٹھ کے لوگ خوف سے زبان بندی پر مجبور ہیں۔

یہاں مرد بھی اتنی مظلوم ہیں تو پھر عورت کا تو پوچھ ہی مت، ساری کانٹوں جیسی رسمیں ان

ہی کے خون سے نبھائی جاتی ہیں کہیں کاروکاری ہے تو کہیں سام بنا کر عورت پر مظالم ڈھائے جاتے ہیں۔

مجھے دیکھ میرا حق قران سے بخشوا دیا گیا ہے، اس صدی میں ایسی جاہلانہ رسمیں ہیں مگر نہیں درحقیقت ہمارے مرد جاہل نہیں ہیں ظالم لالچی اور خود غرض ہیں۔ایسی رسموں کا سہارا لے کر اپنی لالچ پر پردہ ڈالتے ہیں۔یقین کر زیمی اگر یہ اونچی اونچی حویلیاں مردوں کے لیے ہیں ساری خوشیاں مردوں کے لیے ہیں اثر ورسوخ وہ صرف اپنے لیے استعمال کرتے ہیں، دولت سے وہ صرف اور دولت کھینچنے کا کام لیتے ہیں انہیں کسی غریب کی ہوں کی فکر نہیں۔

تو کس کس کر روئے گی زیمل۔

یہ بڑی بڑی باتیں کرنے والے معاشرے میں بدحالی ختم کرنے اور خوشحالی لانے کے دعوے کرنے۔۔۔۔والے کوئی ان کے اندر جھانکے کہ ان کی روحیں تک کتنی بدحال اور سڑی ہوئی ہیں، ان کے مردہ ضمیروں سے کتنی بدبو اٹھتی ہے، وہ بھلا معاشرے میں کیا شائستگی کیا روشنی لاسکیں گے۔

یہ تو کمزوروں اور غریبوں کے اندھیروں کو اور گہرے کرنے والے ہیں، زیمل ان کے سر عورتوں کی پیدائش پر جھکتے ہیں، مگر بابا سائیں کا سر بیٹے کے اور اپنے کرتوتوں پر فخر کرتا ہے، ہا۔۔۔۔فخر جو جانتے ہی نہیں فخر اور شرم میں فرق کیا ہے۔

عابدہ حق نواز کی وازبڑی کاٹ دار تھی وہ ہنس رہی تھیں، مگر ان کی ہنسی ایسی تھی جیسے خالی

برتن میں بہت سے پتھر ڈال دیئے گئے ہوں زیمل بیڈ پر اندھے منہ گر کر بے واز روتی رہی۔

صبح اس کی نکھ بہت دیر سے کھلی، وہ نیچے کھانے کے کمرے میں ئی تو سب ناشتہ کر چکے تھے، بڑی سی میز پر بس مہران شاہ ابھی کر بیٹھا تھا، وہ بھی کر بیٹھ گئی، چھوٹی ماں بھاگل کو ہدایتیں دے رہی تھیں، ادی عابدہ رسوئی میں تھیں، اور جانے کیا تلاش کرنے ئیں تھیں ان کی ظریں یوں ہی زیمل پر اٹھیں مگر وہ مہران شاہ کو دیکھ رہی تھیں پھر اچانک اپنی جگہ سے اٹھی اور دو کرسیاں چھوڑ کر دور جا کر بیٹھ گئی۔

سرخ سرخ انگارہ نکھیں جس میں نیند کا خمار تھا یا نہ جانے کس کا اثر وہ اپنے سامنے رکھے ناشتے کا بغور جائزہ لے رہا تھا، اسے اس بات کی قطعاً پرواہ نہیں تھی کہ اس کمرے میں کون کون ہے اور زیمل کیوں اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔

لا ادھر دے اخبار، کوئی خبر شبر ہے خاص۔ اس نے اس کے سامنے پڑا اخبار مانگا تو اس نے خاموشی سے اخبار اس کی طرف بڑھا دیا۔

بہت سی خبریں اخباروں میں نہیں چھپتیں ادا، شاید اس لئے کہ کسی کو کانوں کان خبر ہی نہیں ہوتی اور گھر جل جاتے ہیں لوگ چپ چاپ مر جاتے ہیں اور دفن ہو جاتے ہیں اپنے ہی تن کی قبروں میں۔

اس نے روٹی توڑتے ہوئے ہستگی سے کہا تو مہران شاہ نے ذرا سا سر اٹھا کر سامنے نظر ڈالی پھر بے پروائی سے دوبارہ اخبار کے صفحے پر نظریں دوڑانے لگا۔

سائیڑن  ج ایک بہت بری خبر ہے میرے پاس۔

بھاگل اس کے  گے چائے رکھتے ہوئے دھیرے سے بولی تو زیمل کا دل جانے کیوں دھڑک اٹھا وہ اس کے بالکل قریب رازدارانہ انداز میں کھڑی تھی اور  واز بھی  ہستہ تھی، یوں بھی رئیس مہران شاہ کی موجودگی میں ہر ملازم بلکہ گھر کے ہر فرد کی  واز پست رہتی تھی۔

کیسی خبر گوٹھ کی ہے کوئی۔

ہا سائیڑن گوٹھ کی خبر ہی تو ہوتی ہے میرے پاس، وہ زہرہ ہے نا چاچا دینو کی دھی، صبح اس کی لاش کنواں سے ملی ہے، وہ پچھواڑے ندی کے پاس والا خالی کنواں ہے نا اس میں،  لاں گوٹھ کے مردوں نے اپنی  نکھوں سے دیکھا ہے۔وہ یہ کہہ کر ٹیبل سے دوسرے جھوٹے برتن اٹھانے لگی، زیمل کے ہاتھ سے نوالی چھوٹ گیا۔

زہرہ کون زہرہ، وہی جو رات کو اغوا ہوئی تھی۔

بے اختیار اس کے منہ سے پھسل پڑا، مہران شاہ نے چونک کر اسکی طرف دیکھا، اس کی لال  نکھوں میں حیرت جھلکی، اماں اور عابدہ بھی اس کی طرف متوجہ تھیں، جب کہ بھاگل ٹکر ٹکر وڈیری زیمل کا منہ تکنے لگی تھی۔

اغوا۔

کک۔۔۔۔کیسے مر گئی، کنواں میں کیسے گر گئی وہ مہران شاہ کی لال ہوئی نظروں سے نگاہیں چراتے ہوئے اس نے بھاگل کو دیکھا۔

سائیں ن چھو خبر، پر گوٹھ والے تو سب یہی کہتے ہیں اسنے جان کر چھلانگ لگائی تھی، اللہ معاف کرے مجھے تو یقین نہیں تا سائیں ن ایسی نیک بچی تھی اپنے ماں باپ کی ایک ہی تھی تھی بھی ایسی تھی نظر بھر کا دیکھ لیں تو نظر لگ جائے سچ مچ مجھے تو ابھی تک یقین نہیں تا۔

بک بک بند کر، جا دفع ہو جا، صبح صبح ایسی منحوس خبریں سنانے بیٹھ جاتی ہے دماغ خراب نہ کر جا۔ اچانک مہران شاہ کی کڑک دار واز گونجی، اور بھاگل سٹپٹا کر وہاں سے کھسک لی۔

یہ خبر تو ج اخبار میں نہیں چھپی ہے نا ادا۔ وہ کچھ توقف کے بعد بولی اور استہزائیہ ہنسی۔

چپ چاپ ناشتا کر دماغ خراب نہ کر میرا۔ جواب ویسا ہی کھردرا یا۔

پڑھ لینا اخبار تو بھی، ناشتہ تو کر لے پہلے دھی رانی۔ چھوٹی اماں اس سے مخاطب ہوئیں گویا مہران شاہ کو اب نہ چھیڑنے کی تنبیہ شامل تھی، مگر اس کا دل جل رہا تھا انگاروں پر لوٹ رہا تھا، رات کا وہ خوفناک منظر پھر نگاہوں میں پھرنے لگا۔

اماں، زہرہ نے خودکشی کی ہوگی، اسے مرنے پر مجبور کیا گیا ہوگا نا پتا نہیں ایسا کب تک ہو گا اس کے مجرموں کو کون بے نقاب کرے گا اور کون انہیں۔۔۔۔ وہ بولتے بولتے چپ ہوگئی۔

مہران شاہ چائے کا کپ زور سے ٹیبل پر پٹخ کر کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا تھا۔

اس بھاگل سے کہنا وہ اپنی منحوس صورت لے کر حویلی سے دفع ہو جائے سوائے گوٹھ والوں کی ٹوہ میں رہنے کے اور کوئی کام نہیں تا، اور تو، دو کتابیں پڑھ کر بہت بکواس کرنے لگی ہے۔ وہ مٹھیاں بھینچتا اس تک یا۔

تجھے گوٹھ کی سب لڑکیوں کے مرنے جینے کی خبریں رکھنے کی ضرورت نہیں ہے، بس اپنا کھانا پینا دیکھ۔وہ شعلہ بار نظروں سے اسے دیکھتا کمرے سے دھم دھم کرتا نکل گیا۔

اے بھا مانی تو کھالے۔چھوٹی ماں اس کے پیچھے لپکیں پھر واپس گئیں۔

پتا نہیں صبح صبح کیا ہو گیا اسے۔

شیطان چڑھا ہوا ہے اماں۔وہ ہتکی سے بڑبڑائی اور خود بھی ناشتہ ادھورا چھوڑ کر چلی گئی۔

لے اب اسے کیا ہوا؟

چھوڑو اماں اسے میں بعد میں سمجھا لوں گی غصہ گیا ہوگا۔ادی عابدہ سر جھٹک کر خیراں کے ساتھ ٹیبل صاف کرنے لگیں۔

او سجاول او بابا سجاول پٹ غلام محمد نے ایک سیڑھی پر قدم رکھ کر حجرے نما حصے کے اندر جھانکا۔

ؤ وچاچا اندر جاؤ۔سجاول نے باہر نکل کر ہاتھ گے کر کے انہیں سہارا دیا۔

پٹ تم ادھر ہو، میں بابا تمہیں پچھواڑے نالے پر بھی دیکھ یا کیا یار دوستوں کی محفل جمائی ہے پھر تو میں غلط وقت پر گیا بابا۔غلام محمد فرش پر بچھی دری پر لڑکوں کو دیکھ کر زرا سا جھینپ گیا۔

ارے نہیں چاچا، بس یوں ہی بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے بیٹھو بیٹھو چاچا۔اس نے بڑے

احترام سے غلام احمد کو کرسی پیش کر دی۔

پٹ تم جو خواب دیکھ رہے ہو بڑے مشکل ہیں میری مانو تو تم رئیسوں سے نہ ہی الجھو تو اچھا ہے۔غلام محمد کے چہرے پر اس کی باتیں سن کر فکر مندی جھلکنے لگی تھی۔

بس چاچا تم بزرگ لوگوں کی باتیں ہی جوانوں کے حوصلوں کو پچھاڑ دیتی ہیں، خرکسی کو تو گے نا ہے۔فرش پر بیٹھا کھوکر بھنا گیا۔

یہ ہمارا حق ہے چاچا، کیا حق کے لئے واز اٹھانا جرم ہے میں نے تو محض بابا سائیں کی وجہ سے نہری پانی کے مسئلے پر بھی چپ سادھ لی وار بندی پر بھی پ تو راضی ہیں ورنہ میں پیچھے ہرگز نہ ہٹتا، مگر اب اسکول کی یہاں بہت ضرورت ہے بلکہ یہ ناگزیر ہے۔ پھر ہم خود رضا کارانہ طور پر کھول رہے ہیں وڈیرہ لوگوں کو کیا تکلیف ہو گی سجاول کا لہجہ پرعزم اور کھرا تھا جو اس کی ذات کا خاصہ تھا۔

گوٹھ کے کئی لڑکے اس کیساتھ تھے کئی پڑھے لکھے تھے جو رضا کارانہ طور پر اپنا وقت اسکول اور بچوں کو دینے پر تیار تھے، ابھی تو وہ لوگ سجاول کے گھر کے پچھلے حصے میں جو خالی پڑا تھا اسکول کھول رہے تھے کچھ چندے اکھٹے کر رہے تھے اور سجاول کا خیال تھا وہ شہر جا کر کچھ بڑے لوگوں سے اپنی جان پہچان والوں سے مشورے اور پیسے اکھٹے کر لائے گا۔

بس ابتدا ہو جائے چاچا الف پڑھا جائے تو یقین کریں لوگ اللہ کو جان لیں گے اور ان جھوٹے معبودوں کے گے جھکنا اور ان سے ڈرنا چھوڑ دیں گے ہم لوگوں کی زندگی اتنی ارزاں

اتنی بے حیثیت نہیں ہے کہ بلا تقصیر سر جھکایا جائے۔ ہر انسان برابر ہے چاچا ہر شخص کو بولنے کا حق ہے اپنے نفع و نقصان کے سوچنے کا اس پر آواز اٹھانے کا حق ہے مگر ہم نے یہ حق خود ہی ان رئیسوں اور وڈیروں کے قدموں میں رکھ دیا ہے۔

میں تو کہتا ہوں سر اتنے نہ جھکاؤ کہ کوئی گردن پر باآسانی پیر رکھ دے اور نہ اتنا اٹھاؤ کہ خدا ناراض ہو کر اسے اپنی تقدیر سے جھکانے پر مجبور کر دے عزت کے ساتھ رہنا چاہیئے، عزت نفس غریب کی بھی ہوتی ہے کوئی بڑا کوئی چھوٹا نہیں، یہ اونچ نیچ کچھ ہماری بزدلی سے پیدا ہو گئی ہے کچھ ہماری کم عقلی سے ان باتوں کے شعور کے لئے تعلیم پہلا قدم ہے اور پہلا قدم کسی کو تو اٹھانا ہی ہے کیوں نہ وہ قدم ہم ہی اٹھالیں۔

سجاول کا چہرہ اس کا رواں رواں بول رہا تھا، وہاں موجود سب کے دلوں کو سحر زدہ کر رہا تھا۔

یہ باتیں صرف الفاظ نہیں تھے سچ تھا جو عقل کے دریچے کھول رہا تھا، بس بات ساری خدا پر توکل کرنے، ہمت اور حوصلے کی تھی، اور یہ حوصلہ سجاول علی شاہ سب میں قطرہ قطرہ انڈیل رہا تھا۔

بشارتوں کا وروان کیلئے نہیں ہے۔

جو منتظر ہیں

سکوں کی منزل خود آپ چل کے قریب آئے

حصول منزل بنا سفر کے نہ ہو سکا ہے

نہ ہوگا

مسافروں کے لئے

سفر کا شعور لازم ہے

سجاول غلام محمد کے ساتھ جب باہر یا تو دھوپ ڈھل چکی تھی موسم بڑا سہانا ہو رہا تھا اسے ج کئی باشعور نوجوانوں کی حمایتیں حاصل ہو گئی تھیں۔ وہ جانتا تھا یہ سب کچھ اتنا سان نہیں ہے مگر ناممکن بھی نہیں تھا اور مشکل اسی وقت مشکل رہتی ہے جب اسے سر نہ کیا جائے۔

گوٹھ کے لوگوں کی بے بسی پر وہ کڑھتا اور جلتا تھا اس کے خیال میں وہ لوگ راہ بھولا ہوا وہ قبیلہ ہیں جو ٹھکانہ بھول چکا ہو ایسی زادی کے خواب کس نے دیکھے تھے یہ زادی تو نہیں تھی جو قائداعظم نے دلائی تھی اقبال نے جس کی نوید دی تھی، یا شاید راہ تے تے ہی قبیلہ اپنی بزدلی اور کم ہمتی سے راہ بھٹک گیا تھا، جہاں اب سوائے دکھ کی دھوپ اور اذیت کے بگولوں کے کچھ نہیں تھا اور وہ ان کا یہی شعور بیدار کرنا چاہتا تھا کہ یہ جو تو نگروں طاقوروں کی تجوریوں میں سکے کھنک رہے ہیں یہ سب ان ہی محنت کش ہاتھوں کی کمائی

ہے یہ جو زمینیں ہیں ان کے مالک یہ لوگ نہیں ہیں بلکہ وہ جوان بازو ہیں جو اس مٹی میں اپنے پسینے کے قطرے کی چمک کے ساتھ بیج بوتے ہیں۔ بنجر زمین کو سر سبز و شاداب کرتے ہیں۔

سجاول پٹ مجھے تجھ پر فخر ہے پر بابا تو اکیلا ہے اور۔ چاچا غلام محمد نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ اپنی سوچوں سے نکل یا۔

ان وڈیروں سرکار لوگوں سے ٹکر لینا کوئی معمولی بات نہیں ہے وہ تو ہم غریبوں کو یوں مسل ڈالتے ہیں جیسے سوکھے پتے ہوں ہم۔

یہی تو المیہ ہے چاچا سائیں کہ ہم سوکھے پتے اور کمزور ٹہنی بن کر رہ گئے ہیں انہیں سر پہ چڑھا دیا ہے انہیں خدا مان لیا ہے یہ کچھ بھی نہیں ہیں، چاچا اگر ہم ہیں تو یہ ہیں ہم نہیں تو یہ بھی نہیں۔

پر پٹ

دیکھو چاچا اوپر چڑھنے کے لئے سیڑھی کی ضرورت پڑتی ہے یا۔ اس نے مسکرا کر غلام محمد کو دیکھا۔

ہاں۔

بس تو یہ سمجھو ہم سیڑھی ہیں اگر سیڑھی نہ ہو کسی کی مجال اوپر تک پہنچ سکے۔ بس سیڑھی کو اپنی حیثیت اور اہمیت کا احساس ہونا چاہیے۔

ہاں پٹ یہ تو ہے۔

چاچا کی موٹی عقل میں کچھ تو یا تھا جو وہ سر ہلانے لگا تھا، سجاول بڑی سنجیدگی سے مسکرا دیا۔

چلیں گھر چلیں ٹھنڈی ٹھنڈی چھاچھ پی کر تازہ دم ہو جائیں بلقیس بھی پ

کو بڑا یاد کرتی ہے ارے یہ تو بتائیں چاچا پ مجھے ڈھونڈ کیوں رہے تھے۔ وہ دونوں

امداد علی کے گھر کی طرف بڑھ گئے۔

بس بابا کیا بتاؤں، دینو کی دھی کا سنا تو دل بڑا دکھی ہو گیا، تم ملے اس سے بہت بری

حالت ہو رہی ہے اس بچے کی۔

ہاں چاچا پتا چلا تھا مجھے بھی۔ سجاول کے چہرے پر اداسی کا رنگ بکھر گیا۔ میں گیا تھا اس

کے گھر۔

جوان بیٹی کا روگ ہے پٹ کوئی معمولی بات نہیں بے چاری کا مہینے کے خر میں بیاہ

ہونے والا تھا۔

غلام محمد نے گھر میں داخل ہو کر چار پائی سنبھال لی دین محمد عرف دینو کی دیرینہ دوستی تھی

غلام محمد سے، یوں بھی گوٹھ والوں کے دکھ سکھ سانجھے ہوتے ہیں۔

اداوڈیری زیمل ئی تھی۔ بلقیس اسے کمرے میں جاتے دیکھ کر تیے ئی اور سرگوشی میں

بولی، تو اس نے پلٹ کر دیکھا ایک لمحے بلقیس یوں کھسیا گئی جیسے وہ کوئی جرم کر گئی ہو۔

اچھا۔۔۔۔کیوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ سجاول نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ

پوچھا، مگر دل کے اندر بڑے خوبصورت جذبے بکھرنے لگے۔

تجھ سے ملنے، اسے پتا چلا تم شہر جا رہے ہو اسی لئے۔ وہ بڑی پریشان تھی ادا، بھاگل کو بھی

پتا نہیں کیوں رئیس مہران شاہ نے حویلی سے نکال دیا ہے مائی زرینہ میرے پاس ئی تھی اس کا پیغام لے کر پھر میں جا ہی نہیں سکی۔

ہوں، تم چاچا کو ٹھنڈی چھاچھ دو، میں ذرا کپڑے بدل لوں۔ وہ بات کے جواب میں بس اتنا کہہ کر کمرے کے اندر چلا گیا۔

نکھوں کے دریچے

تب سے کھلے ہیں

جب سے تمہیں دیکھا ہے

مجھے ایسا لگا کہ

زندگی میری

تیری نکھوں میں

اتر چکی ہے

اس نے ڈائری کے اندر بال پین رکھ کر ڈائری بند کر دی اور اس پر سر ٹکا کر جذبوں سے بھری بوجھل مخمور نکھیں موند لیں۔

اسی دم دروازہ زور سے کھلا وہ جلدی سے سیدھی ہو بیٹھی، رئیس مہران شاہ دروازے کی چوکھٹ پر کھڑا تھا۔

مہران شاہ کو اپنے کمرے کے دروازے پر دیکھ کر اس نے ڈائری جلدی سے تکیے کے

نیچے سیڑ دی اور قریب پڑی اجرک اٹھا کر بدن پر ڈال لی۔

رئیس مہران شاہ کبھی بہنوں کے کمرے میں اس طرح بلا دستک نہیں یا کرتا تھا ج بغیر دستک دیے دروازہ کھول کر اندر جانے والے فعل سے وہ خفیف سا ہو کر رہ گیا۔

کوئی کام ہے ادا۔

ہوں۔اس نے ہنکارا ابھرا اور دو قدم اندر گیا۔کیا کر رہی ہو؟اس نے یوں ہی کمرے میں طائرانہ نظر ڈالی پھر اس کے چہرے پر اپنی نکھیں گاڑ دیں۔

ایک پل زیمل کا دل بہت زور سے دھڑ کا،مہران شاہ کے چہرے پر پتھریلا پن نظر رہا تھا،جس کے پیچھے ابلتا غصے کا سرخ خون تھا۔

کوئی کام تھا تو مجھے بلوالیا ہوتا ادا۔وہ احتر اما بولی۔

تجھے زہرہ کے بارے میں کس نے بتایا۔

اس نے اس کی بات کاٹی اور کچھ فاصلے پر رک کر بغیر تمہید کے بولا،اس کے سوال پر زیمل نے سر اٹھایا مگر دوسرے لمحے گھبرا کر جھکا دیا۔

کیا مطلب۔۔۔۔کیا زہرہ کے بارے میں۔

دیکھو زیمل میں لگی لپٹی بات کرنے کا عادی نہیں ہوں،نہ میں اتنا احمق اور سیدھا ہوں، تجھے کسی نے بتایا کہ اس لڑکی کو میں نے اغوا کیا تھا۔

اس نے گویا دھماکے سے زیمل حق نواز کے سر پر اینٹ دے ماری اس کے اعصاب لمحہ

بھر کے لئے سن ہوگئی، سینے کی چہار دیواری میں دل زور سے دھڑکنے لگا۔

بول، کس غدار نے تجھے یہ خبر پہنچائی، اس حویلی میں ایسی باتیں کرنے والا کون ہے جس نے میری پیٹھ میں چھرا گھونپا ہے، بتا زیمے میں اس کا خون پی جاؤں گا۔ وہ بے حد مشتعل دکھائی دے رہا تھا، یوں جیسے زیمل کے منہ سے کسی کا نام سنتے ہی وہ اس کا خون کرنے چل دے گا۔

یہاں تو ادا، سب ہاتھ جوڑ کر سر جھکانے والے غلام ہیں، تیرے، کون نمک حرامی کی جسارت کر سکتا ہے۔ وہ بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی، رئیس مہران نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گویا چھید ہی ڈالا۔

زیادہ فلسفہ نہ بول، سیدھا سادا جواب دے جو پوچھ رہا ہوں۔ اس کی واز دھیمی مگر کرخت تھی۔

وہ اضطرابی انداز میں ہاتھ مسلنے لگی، اس کا دل خوف کی دلدل میں دھنستا اور ابھرتا جا رہا تھا پھر ہمت کر کے اس نے سر اٹھایا۔

میں نے، میں نے اپنی نکھوں سے دیکھا تھا ادا وہ منظر۔ اس کی واز پست تھی مگر مہران شاہ کی سماعت تک پہنچ گئی تھی، اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، فوری طور پر وہ کچھ بھی نہ بول سکا، چہرہ لال ہوگیا، ہونٹ بھینچ گئے، نظریں اس کے چہرے سے ہٹا کر دیوار پر کرلیں مگر دوسرے ہی لمحے وہ اپنی کھسیاہٹ غصے میں چھپاتا ہوا دھاڑا۔

جھوٹ بول رہی ہے تو، پردہ رکھ رہی ہے کسی کا تو بھلا رات کو باہر کہاں تھی۔

میں گڈی میں تھی، بچل کی تھین (بہن) کی سگائی سے رہی تھی تب۔ اس میں جانے کیسے اتنی ہمت گئی تھی کہ وہ بپھرے ہوئے مہران شاہ کے سامنے بغیر جھجکے بول رہی تھی۔

شاید اس لئے کہ اس کی پوزیشن کمزور تھی اور وہ خود بے قصور بلکہ اس کی کمزوری اس کے ہاتھ میں تھی مگر بہر حال وہ نا شائستہ بھی نہ تھی کہ اس کا کوئی فائدہ اٹھانے کا سوچتی۔

ادھر غسل خانے سے نکلتی عابدہ کا کلیجہ دھک سے رہ گیا تھا، انہوں نے مہران شاہ کی واز پر جلدی سے دروازہ کھول ڈالا تھا اور اب ہاتھ میں تولیہ پکڑے ساکت کھڑی تھیں تولیہ سے منہ پوچھنا بھی بھول گئی تھیں۔

میں ویسے بھی سنی سنائی باتوں پر زیادہ یقین نہیں کرتی ادا۔

اچھا زیادہ بک بک نہ کر، تجھے بابا سائیں نے شاید زیادہ ہی زادی دے رکھی ہے۔

مہران شاہ کا حلق تک کڑوا ہو گیا تھا۔

تو نیا نڑی (بہن بیٹی) نہ ہوتی تو میں تجھے اس بکواس پر دھن کر رکھ دیتا، کان کھول کر سن لے زیمل، تو نے جو دیکھا اسے بھول جا، تیرے حق میں یہی بہتر ہے ورنہ۔

میں تو بھول جاؤں گی ادا پر خدا تو نہیں بھولے گا۔

زیمل۔ وہ غضبناک ہو کر اس کی طرف بڑھا، اس کا بھارہ ہاتھ فضا میں اٹھا ہی تھا کہ سرعت سے قریب تی ادی عابدہ نے پکڑ لیا۔

نہ ادا، یہ ابھی ناسمجھ ہے۔ اس نے نرمی سے بھائی کا ہاتھ جھٹک دیا۔

اسے سمجھا دے ادی، ناسمجھ ہے تو اتنی سمجھداری دکھانے کی ضرورت نہیں ہے اسے، ورنہ کسی دن میرے ہاتھوں سے قتل ہو جائے گی، چار جماعتیں پڑھ کر خود کو نہ جانے کیا سمجھ رہی ہے۔

وہ اسے تیغ صفت نظروں سے گھورتا، قدموں سے زمین کو روندتا کمرے سے اوجھل ہو گیا۔

زیمل نے دکھ کے ساتھ، کمرے کا دھماکے سے بند ہوتے دروازے کو دیکھا پھر بیڈ پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپ لیا۔

نفرت غصے اور تاسف سے اس کی آنکھوں میں دھند کا غبار چھا گیا۔

بہت بری بات ہے زیمل، جیسا بھی ہے وہ بھائی ہے تیرا، سر کا آنچل ہے ہمارا، چڑی، دکھ اور غصہ مل جائے تو بڑی تباہیاں لاتی ہیں۔ ادی عابدہ سرزنش کرنے والے انداز میں بولیں اور کرسی پر بیٹھ کر اپنی چوٹی کے بل کھولنے لگیں۔

اونہہ، ہمارے سر کا آنچل ہیں، مگر کتنے سروں کی چادریں کھینچ رہے ہیں عورت صرف حویلی کی عورتیں تو نہیں ہیں ادی، عزت اس حویلی کی عورتوں کی ہی نہیں ہوتی، میرا دل جل رہا ہے ادی، ادا امبران بجائے شرمسار ہونے کے الٹا مجھے دھمکی دے گیا زبان بندی کی۔

اچھا بس، جو ہو گیا اسے بھول جا، تیرے دل جلانے اور کڑھنے سے نظام نہیں بدلے گا،

نہ زہرہ واپس زندہ ہو جائے گا، چل اٹھ تجھے زینت ماں بلا رہی تھیں۔

عابدہ کا چہرہ بڑا سپاٹ تھا، جیسے اس سارے واقعے کا خاص نوٹس نہ لیا ہو، زیمل نے آنکھیں اٹھا کر انہیں ایک نظر دیکھا۔

تو یہ چاہتی ہے ادی کہ میں بھی تیری طرح بے حس، بے تاثر اور تمام جذبوں سے عاری ہو جاؤں اپنے تمام احساسات اور فطری رویوں پر اتنی برف گرا دوں کہ میرا وجود بھی ایک تودہ ہو جائے نہیں میں ایسی زندگی نہیں گزار سکتی۔ وہ اپنے دماغ کی کھولن کم کرنے کے لئے باتھ روم میں چلی گئی۔

اتنی بڑی ان دنیاؤں میں

اپنے نام کی تختی والی ایک عمارت

کتنے دکھوں کی اینٹیں چن کر گھر بنتی ہے

پتھر پتھر جوڑ کے دیکھو

میں نے کبھی ایک گھر ہے بنایا

رنگوں، پھولوں، تصویروں سے اس کو سجایا

دروازے کی لوح پہ اپنا نام لکھایا

لیکن اس کے ہر کمرے میں تم رہتے ہوئے

سجاول شاہ نے اپنی روشن آنکھیں اوپر اٹھائیں اور زیمل کو دیکھا جس کے رخساروں پر

محبت پا لینے کا نشہ سرخی بن کر جھلک رہا تھا سجاول سے نظریں ملیں تو اس نے اپنی پلکیں جھکا دیں۔

سوچتا ہوں اتنا بوجھ اٹھا سکوں گا بھی یا نہیں۔

اس کے لہجے میں سرشاری بھی تھی اور بے یقینی بھی، اس نے خوب صورت کارڈ پر لکھی نظم پر نظریں ڈالیں پھر اسے اپنی رائٹنگ ٹیبل پر رکھی ڈائری میں احتیاط سے رکھ دیا جیسے کوئی بہت قیمتی شے ہو۔

محبت بوجھ تو نہیں ہوتی سجاول۔

وہ کرسی پر بیٹھ گئی مگر نظریں نہ اٹھائیں ہاتھوں میں پڑے کنگن پر انگلیاں پھیرنے لگی۔

ارے، وڈیری زیمل حق نواز، تم تو شاعرہ اور فلسفی ہو گئی ہو۔ وہ ذرا سا ہنس دیا اور دیوار سے لگ کر اسے محبت بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔

وہ ج اس سے ملنے ئی تھی اپنے چاچا کے گھر کا بہانہ کر کے بچل ہی اسے گاڑی میں چھوڑ گیا تھا، وہ بڑا خاموش راز داں بن گیا تھا اور گھر میں اس کی سکھی بلقیس تھی جو اس دوطرفہ محبت پر مسرور بھی تھی اور خوفزدہ بھی۔

تم کل جا رہے ہو شہر۔

وہ اسکی نگاہوں کی محویت توڑنے کی خاطر بولی، کیا سجاول کی روشن خوب صورت نکھوں میں تھا، ایسے رنگ تھے کہ اس کا دل شوریدہ سر ہونے لگا تھا۔

ہوں، ہاں جا تو رہا ہوں۔

پھر کب وُ گے۔اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

نا جانا تو رہتا ہی ہے نا، بس پڑھائی کے تو صرف چھ ماہ ہیں۔

سجاول۔وہ اضطرابی انداز میں اپنی نازک نازک انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے کرسی سے اٹھ گئی۔

نہیں زیمل اپنے دل میں کسی خدشے کو جگہ نہ دینا، سجاول شاہ تم سے کوئی کھیل نہیں کھیل رہا۔

سجاول کا چہرہ یکدم سنجیدگی میں ڈھل گیا وہ زیمل حق نواز کے اضطراب پر یہ ہی نتیجہ اخز کر سکا تھا وہ تڑپ گئی۔

نہیں سجاول، خدا نہ کرے نہ میں کبھی ایسا سوچوں، پر مجھے وسوسے ستانے لگے ہیں، مجھے ڈر لگنے لگا ہے۔اس کی واز کانپ گئی، اس کے تصور میں مہران شاہ کا سراپا ابھر یا۔

کل رات اس نے جو رویہ اس کے ساتھ اپنایا تھا۔

اس کا تو کبھی اسے گمان بھی نہ تھا کہ وہ اس کے سر کا سائیں، اس کا بھائی ہو کر اس کے ساتھ ایسے پیش ئے گا اب ایک عجیب طرح کا خوف اس کے اندر سمٹنے لگا تھا، اس کی پلکوں پر خود بخود نمی بکھر گئی۔

سجاول نے بے اختیار اس کی وہ لانبی انگلیاں اپنی مضبوط انگلیوں میں تھام لیں۔

زیمل کا چہرہ ایک پل اس کے لمس کی حدت سے سرخ ہوا۔

اب ڈرنے لگی ہو، کیا وڈیری بن کر سوچنے لگی ہو۔ وہ ہولے سے ہنسا۔

میں تو تمہیں بڑا بہادر سمجھ رہا تھا، وڈیری حق نواز، پر تم تو وہی چڑیا جتنا دل رکھنے والی لڑکی نکلیں۔ وہ اس کے ہنسنے اور لطیف طنز پر برا مانے بغیر مسکرا دی۔

سجاول شاہ لڑکی خواہ کسی طبقے کسی خطے کی ہو، ایک سا دل رکھتی ہے اور جب آنکھیں خوابوں سے سج جائیں دل تمناؤں کے سیل شوق میں بہنے لگے، تو خود بخود، وسوسے اور اندیشے سر اٹھانے لگتے ہیں، میں اب ڈرنے لگی ہوں سجاول کہ میں کچھ کھونا نہیں چاہتی

اتنی بڑی ان دنیاؤں میں

اپنے نام کی تختی والی ایک عمارت

کتنے دکھوں کی اینٹیں چن کر گھر بنتی ہے

پتھر پتھر جوڑ کے دیکھو

میں نے بھی ایک گھر ہے بنایا

رنگوں، پھولوں، تصویروں سے اس کو سجایا

دروازے کی لوح پہ اپنا نام لکھایا

لیکن اس کے ہر کمرے میں تم رہتے ہوئے

سجاول شاہ نے اپنی روشن آنکھیں اوپر اٹھائیں اور زیمل کو دیکھا جس کے رخساروں پر

محبت پا لینے کا نشہ سرخی بن کر جھلک رہا تھا سجاول سے نظریں ملیں تو اس نے اپنی

پانا چاہتی ہوں۔ اس نے چہرہ اوپر اٹھا کر اپنے قریب کھڑے سجاول علی شاہ کو دیکھا۔

مگر کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا تو پڑتا ہی ہے۔ وہ اس کا ہاتھ چھوڑ کر اس سے دور ہٹ کر

بڑی سنجیدگی سے بولا۔

میرے نزدیک ، بے حیثیت، فانی اور مادی چیزوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے، تمہارا

مطلب اگر میرے اونچے مرتبے، حویلی اور جائیداد سے ہے تو، میں نے کبھی ان چیزوں کو

جذبوں کے گے اہمیت نہیں دی، مجھے اپنے خواب اور زیادہ عزیز ہیں۔

وہ رخ کھڑکی کی طرف کر کے باہر دیکھنے لگی کہ یکدم اس کی نکھیں چمک اٹھیں، وہ

کھڑکی پر جھولتا پردہ پورا ہٹا کر اب باہر غور سے دیکھ رہی تھی، لگ رہا تھا کوئی بہت خوش کن منظر

دیکھ رہی ہے، وہ خوشی خوشی پلٹی۔

سجاول۔۔۔۔۔یہ۔۔۔۔۔یہ۔۔۔۔۔۔اسکول۔ اس کی نکھوں میں خوشگوار حیرت تھی،

سجاول کھڑکی کے پاس چلا یا اور باہر دیکھنے لگا، اس کا چہرہ بھی چمکنے لگا، وہ بڑی طمانیت سے

مسکرانے لگا۔

ہاں، یہ اسکول ہے جو رات دن کی محنت کے بعد کھلا ہے، نام نہاد اسکول ہی سمجھو۔

کب کھلا یہ۔ وہ پر مسرت لہجے میں پوچھتے ہوئے پھر باہر جھانکنے لگی۔

بس ہفتہ بھر ہوا ہے، جگہ خالی پڑی رہتی تھی، بابا سائیں یہاں دو کمرے بنوانا چاہ رہے

تھے مگر میں نے یہ خالی حصہ اسکول کے لئے لے لیا، آ ؤ تمہیں دکھاؤں۔ وہ اس کا ہاتھ تھامے کمرے سے نکل کر پچھواڑے حصے میں گیا۔

چھوٹی سی جگہ پر ابنس کی چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں، جن پر چند بچے بیٹھے تختی پر لکھے حرفوں کو پڑھ رہے تھے، قریب ہی ایک چھوٹی سی میز اور کرسی رکھی تھی جہاں دینو بابا کا نو عمر بیٹا، استاد کے فرائض انجام دے رہا تھا۔

ابھی تو ابتدا ہے، بس گوٹھ والوں کی توجہ کی ضرورت ہے پھر ہستہ ہستہ بچے بھی نے لگیں گے، اسے تم شہر کے اسکولوں سے کمپیئر نہ کرنا، بس یوں سمجھو یہ ابتدائی زمانے کی طرح ہے، جہاں پہلے لوگ علم کے حصول کے لئے سفر کرتے تھے، فرش پر بیٹھ کر مٹی میں اٹ کر علم حاصل کرتے تھے محض اپنے جذبہ شوق کی وجہ سے۔

اور بدقسمتی یہ ہے کہ اتنی ترقی کرنے اور وافر سہولیات ہونے کے باوجود، یہ غریب گوٹھ والے اب بھی علم اتنی مشکلوں سے حاصل کر سکتے ہیں اور دیکھو کر بھی سکتے ہیں یا نہیں، میری اور دوسرے لڑکوں کی ادنی سی کوششیں ہیں یہ۔

اسکول کے صحن میں کھڑا سجاول منافکانہ لہجے میں کہہ رہا تھا تاہم وہ اس نقطے کے غاز سے ہی انتہائی خوش تھا، جیسے کوئی معرکہ سر کر لیا ہو اور جیسے یہ اختتامی مرحلہ ہو۔

زیمل کی خوشی بھی دیدنی تھی وہ بھی یوں مسرور دکھائی دے رہی تھی، جیسے یہ کارنامہ خود اس نے انجام دیا ہو، اس نے بڑے فخر اور محبت سے سجاول کو دیکھا۔

گے بہت مشکلیں ئیں گی سجاول، کیسے سر کرو گے۔ سجاول کندھے اچکا کر، اس کے ساتھ کھلی فضا میں گیا۔

مشکلیں تو ہوتی ہی سر کرنے کے لئے ہیں، بس تم دعا کرنا کہ خدا گوٹھ والوں کو بھی استقلال عطا کرے اور مجھے بھی، باقی کام، زور بازو جب تک سلامت رہے پورا ہو ہی جائے گا، بس استقامت ہو اور خدا پر بھروسہ کچھ مشکل نہیں اور وہ مرد ہی کیا جو مشکلوں کو سر کر کے مسرور نہ ہو۔

یقین کرو زیمل میری خواہش ہے کہ ہمارے گوٹھ کا بچہ بچہ اتنا باشعور ضرور ہو جائے کہ اپنا برا بھلا پہچان سکے ان بڑے لوگوں کو ہی اپنا سب کچھ نہ مانیں ان کے گے جھکنے سے بہتر مر جانا پسند کریں۔ اس کا چہرہ فرط جذبات سے تپنے لگا۔

کیا میں بھی جہاد میں شامل ہو سکتی ہوں۔

اس کی نرم واز ابھری اس نے اپنے ہاتھوں کے سنہری کنگن اتار کر سجاول کی طرف بڑھا دیئے۔

ایک اینٹ میرے نام کی بھی ہونی چاہیے۔ سجاول، مجھے بھی تو فخر کرنے کا موقع ملے۔

سجاول لمحہ بھر کو گنگ رہ گیا، اس کی نظریں اس کی سونی کلائیوں پر جم گئیں۔

نہیں، نہیں زیمل یہ پہن لو۔ اس نے بھاری لہجے میں کہا۔

کیوں یہ میں تمہارے اپنے خرچے کے لئے تو نہیں دے رہی، یہ تو میں ان معصوم اور ننھی

کونپلوں کو پیاری کے لئے دے رہی ہوں، میرا دل بھی چاہتا ہے کہ یہ کونپلیں اب نرم لچکتی شاخ نہ بنیں جس سے ٹکرانے والا خود پاش پاش ہو جائے، رکھ لونا سجاول۔ اس کا لہجہ التجائیہ ہو گیا، پلکوں پر ستارے جگمگانے لگے۔

سجاول نے یہ کنگن لیتے ہوئے اس کے ہاتھ بھی تھام لیے۔

ان کلائیوں میں ایک دن اپنے ہاتھوں سے بہت سا زیور پہناؤں گا۔ اس کی واز بڑی بوجھل تھی۔

زیمل کا دل ایک انوکھی خوشی سے بھر گیا، ایسی خوشی جو کبھی محسوس نہ ہوئی ہو۔

مجھے چاندی اور سونے کے کھنکتے زیورات کی کبھی تمنا نہیں رہی سجاول، یہ ہوں بھی تو کیا اور نہ ہوں بھی تو کیا۔ اس کی پلکیں اٹھیں پھر لرز کر جھک گئیں۔

میں، میں بھی، ہر عورت کی طرح سہاگن بننا چاہتی ہوں، کیا مجھے اپنے نام کا زیور پہناؤ گے سجاول، ایسا زیور جو کبھی نا اترے، میری روح کو شانت کر دے، میری زندگی کو سونا بنا دے۔

سجاول علی شاہ اسے بڑی پیاری نظروں سے دیکھنے لگا، وہ اپنے ہر رنگ میں اتنی ہی خوبصورت دل موہ لینے والی تھی یا صرف اسے لگا کرتی تھی۔

اس نے نرمی سے اس کے نازک ہاتھ پر اپنے ہاتھ کا دباؤ ڈال کر خاموشی کی زبان میں یقین دلایا۔

وڈیری زیمل۔ بلقیس کی واز ابھری تو وہ دونوں عالم مدہوشی سے حال میں گئے، وہ

جلدی سے پیچھے ہٹی تھی، سجاول بھی قدرے جھینپ کر بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔

حویلی سے گڈی گئی ہے ادا اچل انتظار کر رہا ہے۔

اوہ، اتنی دیر ہوگئی ہے۔اس نے اپنے سرخ سرخ چہرے کو اٹھا کر بلقیس کی طرف دیکھا بلقیس شرارت سے مسکرانے لگی۔

بہت شریر ہوگی ہو۔اس نے ہلکی سی پیار بھری چپت اسے ماری تو وہ اپنے پیارے بھائی کے شانے سے لگ گئی، سجاول نے اسے دائیں بازو کے گھیرے میں لے لیا۔

اب اس کا بھی انتظام کرنا پڑے گا، کیوں زیمل ۔وہ بولا تو اب شرمانے اور جھینپنے کی باری بلقیس کی تھی۔

زیمل حق نواز سجاول سے ملاقات کر کے اپنے اندر بے پایاں مسرت سمیت کر حویلی میں ئی تو چھوٹی ماں زینت نے اسے بتایا کہ بابا سائیں اسے یاد کر رہے تھے، وہ پیغام سنتے ہی بابا سائیں کے کمرے کی طرف چلی ئی مگر دروازے پر دستک دینے سے پہلے اندر سے ئی واز پر اسکا ہاتھ ٹھہر گیا، یہ بابا سائیں کی واز تھی۔

ہاں یہ لڑکا سجاول بھی بڑا اونچا اڑ رہا ہے ج کل، چلو دیکھتے ہیں کتنا اڑ سکتا ہے۔

پ اس روز بھی اس کی بدتمیزی برداشت کر گئے تھے بابا سائیں جبکہ میرا تو رت (خون) ہی کھول اٹھا تھا، یہ مالکوں سے بات کرنے کا کونسا انداز ہے اس کا، دو چار کتابیں پڑھ کر ہمارے منہ ئے گا۔

یہ مہران شاہ کی واز تھی کڑوی، کھردری اور غرور سے بھری ہوئی۔

کمدار، کیا رپورٹ لائے ہو، ذرا بابا سائیں کو بھی بتاؤنا، پتا نہیں اب بابا سائیں اتنے بے خبر کیوں رہنے لگے ہیں۔

سائیں جو کہوں گا سچ کہوں گا، سچ کے سوا کچھ نہ کہوں گا۔

کمدار کی واز ابھری اور بابا سائیں کے حقے کی گڑگڑاہٹ تیز ہوگئی۔

امداد علی کے اس چھوکرے نے اپنے گھر کے خالی حصے میں اسکول کھول لیا ہے سائیں، میں نے اپنی گناہگار نکھوں سے دیکھا ہے دو چار بچے بھی بیٹھے تھے اور زور زور سے پڑھ رہے تھے وہ امبوں ( موں ) کی فصل پر کام کرنے والی دینو اس کا چھوکرا ماستر بنا ہوا ہے۔

کمدار یہ کہہ کر چپ ہوا تو ایک دو لمحے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

ادھر زیمل کا دل سینے کی چار دیواری میں کانپا اس کے کان بابا سائیں کا جواب سننے کے منتظر تھے اور دل ایک انجانے خوف سے دھڑکنے لگا تھا۔

ہوں، تو یہ چھوکرا عملی میدان میں بھی اتر چکا ہے۔

دیکھ لیجیے، یہی امداد علی جو ہمارے سامنے ٹھیک سے کھڑا نہیں ہو پاتا اس کا بیٹا ہمارے برابر کھڑا ہونے لگا ہے۔

معافی سائیں، میں نے سجاول کو گوٹھ کے دوسرے چھوکروں کو جمع کرکے بڑی بڑی تقریریں کرتے بھی دیکھا ہے۔

وہ کیا کہتے ہی، ہاں۔۔۔۔۔۔۔وہ حق وق کی باتیں کرتا ہے۔ان سے۔

ہوں، حق کونسا حق کیسا حق۔ بابا سائیں کی  واز میں گرج تھی وہ تیزی سے کرسی سے اٹھے۔

یہ ہمارے کمی کمیں۔ مزارے جو ہماری ہی زمینوں پر کام کرتے ہیں کیا یہ اب ہمارے کھیتوں پر اپنا حق جتائیں گے، ہمارے تلوے چاٹنے والے ہمارے منہ پر طمانچے ماریں گے بابا، یہ کل کا چھوکرا انقلاب لانے کا خواب دیکھ رہا ہے سب کو، ہیرو بنا پھرتا ہے گوٹھ میں، کمدار کتنے بچے پڑھ رہے ہیں اس اسکول میں؟

سائیں ابھی تو چار پانچ ہی ہیں پر سنا ہے گوٹھ والے بڑے خوش ہیں۔

دیکھا دیکھا بابا سائیں  پ نے۔مہران شاہ تلملا کر اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔

پ اجازت دیں، تو میں  ج ہی کچھ  دمی بھیج کر اس ڈربے نما اسکول کی دیواریں ڈھا دوں۔

نہ پٹ اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔بابا سائیں جلدی سے بولے۔

کمدار۔

حکم سائیں۔

تم ایسا کرو بابا، کہ جو بچے اس اسکول میں داخل ہیں اور جو داخل ہونا چاہیں ان کا پتا کرو اور پھر ہمیں بتاؤ

بابا مہران دیواریں ڈھانے سے پھر دیواریں بن جائیں گی ان دیواروں کے اندر نے والوں کو ہی ڈرا کر روک دیا جائے تو۔۔۔۔۔۔خالی دیواریں ملبے کی طرح ہی ہو جائیں گے۔

کیوں کمدار، ڈرانے والے دمی تو ہیں نا تمہارے پاس، مگر ہاں اتنی جلدی شروع نہ ہو جانا ابھی انتظار کرو۔

یہ مہران شاہ تو جذباتی ہو جاتا ہے بابا اس طرح تو تم، کسی کام نہ رہو گے تحمل پیدا کرو اپنے اندر، یہ بچے اور کھردرے لوگوں کی طرح جذباتی ہو جانے والی عادت خاص فائدہ مند نہیں ہوتی بلکہ ہاتھ سے بہت کچھ نکل جاتا ہے، ہمیشہ ٹھنڈا کر کے کھاؤ گرم کھانے سے منہ جل جاتا ہے پتر، یاد رکھنا جو کام نکھ کے اشارے سے ہو جائے وہاں زبان نہیں کھولتے، اور جو کام زبان سے ہو رہا ہو، وہاں لاٹھی نہیں اٹھاتے۔

بابا سائیں کی ہنسی ابھری جو تیر بن کر زیمل حق نواز کی رگ رگ کو چھید گئی۔

اس سے اب مزید کھڑا نہ رہا گیا، وہ پلٹی تو سامنے تے سلطان شاہ کو دیکھ کر اسے سنبھلنا پڑا۔

کیا ہوا، خیر تو ہے ادی۔ اس کا سفید پڑتا چہرہ دیکھ کر وہ ٹھ کر رک گیا۔

ہاں سب خیر ہے۔ وہ زبردستی مسکرانے کی کوشش کرنے لگی۔

پر تمہارے چہرے سے تو نہیں لگتا۔ سلطان شاہ مسکرایا اور نرمی و محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

کیا بات ہے ادی، کوئی بات ہوگئی ہے، بابا سائیں نے کچھ کہہ دیا ہے۔

ارے نہیں وہ بس تھکن ہوگئی ہے چاچا کے یہاں سے ئی ہوں نا اب ذرا رام کروں گی۔ وہ مزید رکی نہیں اور سلطان شاہ کا ہاتھ نرمی سے تھپک کر سیڑھیاں چڑھ گئی۔

بابا سائیں کی باتوں نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا اسے لگا اس کی ساری خوشی ساری مسرت بھک سے اڑگئی ہو، اب ایک خوف دل میں سمٹ یا تھا۔

(کہیں وہ لوگ سجاول کو کوئی نقصان نہ پہنچا دیں اوف۔۔۔۔۔ کتنے فخر سے وہ اسے اسکول دکھا رہا تھا۔)

اس کی نکھیں جلنے لگیں چہرے پر اتنا سارا پانی بہانے کے باوجود ایک گ تھی جو رگ رگ سے نکلتی محسوس ہو رہی تھی، کسی پل قرار نہیں رہا تھا۔

دوسری صبح وہ بچل کو چہیر و چمکاتے دیکھ کر چپکے سے اس کے پاس چلی ئی، بچل اسے دیکھ کر ٹھ گیا، تشویش اس کے چہرے سے جھلک رہی تھی۔

بچل، کیا سجاول شہر چلا گیا۔ اس کے لہجے کی بے چینی پر بچل نے ذرا سا سر اٹھا کر دیکھا پھر جلد ہی احتراماً جھکا بھی دیا۔

منہ اندھیرے ہی نکل گیا تھا بس کا وقت وہی ہوتا ہے نا۔ اس نے کہا تو اس کے چہرے پر اطمینان کا رنگ پھیل گیا، ایک گہری سانس اس کے سینے کی تہہ سے خارج ہوگئی۔

اس کے پیچھے اسکول کا خیال کون کرے گا تمہیں خبر ہے کچھ۔

خیال کیا کرنا ہے جی خود ہی بچے جاتے ہیں اور بڑے لڑکے پڑھا دیتے ہیں۔اس کے انداز میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

خواہ مخواہ کی دردسری لے رکھی ہے اس نے بھی سائیں۔

اس نے کچھ سوچ کر کپڑا دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ میں لے کر اضطرابی انداز میں جھٹکا پھر سر اٹھا کر زیمل حق نواز کو دیکھا اور نکھیں جھکا لیں۔

ایک بات کہوں، برا تو نہ لگے گا۔وہ کچھ ہچکچا کر بولا، زیمل مسکرانے لگی۔

برا لگے گا تو بتا دوں گی بولو تم۔

بات یہ ہے سائیں کہ۔۔۔۔۔ پ سجاول کو سمجھائیں کہ وہ یہ اسکول وسکول کا دھندا نہ پالے، وہ نہیں جانتا اس کے نتائج کچھ اچھے نہیں نکلیں گے، میرا مطلب ہے۔

جانتی ہوں، بابا سائیں نے تو ابھی سے اس اسکول کو ڈھا دینے کا سوچ لیا ہے۔

وہ اس کی بات کاٹ کر یاس بھرے لہجے میں بولی تو بچل نکھیں پھاڑے زمین کو گھورنے لگا اس کے چہرے سے تشویش جھلکنے لگی۔

اسی لئے تو پوچھا تھا سجاول تو شہر چلا گیا نا، مجھ سے زیادہ تو شاید تم ہی جانتے ہو گے بچل بابا سائیں ادا مہران اور لال حویلی والوں کو۔

وہ بہت ضدی ہے میری سنتا ہے، نہ ابا کی۔بچل منہ پر ہاتھ پھیرتا ہوا اضطرابی انداز میں

انگلیاں مروڑنے لگا۔

سائرن، پ کی تو وہ مانتا ہے پ ہی اسے سمجھاؤ۔اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا تو ایک لمحے کو زیمل کے چہرے پر سرخی اتر ئی، اس نے جلدی سے چادر پیشانی تک کھینچ لی، پھر سنبھل کر بولی۔

نہیں بچل میں اس کو نہیں روکوں گی، اچھائی کا راستہ نہیں روکتے ورنہ ایک دن ہم سب برائیوں سے بھر جائیں گے۔وہ پلٹ کر وہاں سے چلی گئی۔

سجاول علی شاہ کی یہی خوبیاں، یہی دلیرانہ جرائت تو اس کا فخر اور مان تھیں وہ اسے اچھا لگتا تھا اس لئے کہ وہ سب کے لئے اچھا تھا وہ صرف اپنے لئے جینا نہیں چاہتا تھا بلکہ اس کے دل میں غریب اور کمزور کے لئے ہمدردی تھی، خلوص تھا، وہ خواب دیکھتا تھا صرف اپنے لئے نہیں گوٹھ والوں کے لئے، ان کی بہتری اور خوشحالی کے لئے وہ کیسے اسے نیکی کی راہ سے روک دیتی، خوبصورت خواب دیکھنے پر پابندی لگا دیتی۔

مگر بچل اس کی سوچ سے الگ پریشان سا بجیرو کے قریب فرش پر اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

بچڑی زیمل۔وہ بیٹھک کے پاس سے گزری تو بابا سائیں کی پکار پر رک گئی اور پردہ اٹھا کر اندر گئی۔

جی بابا سائیں

وہ ان سے فاصلے پر کھڑی ہو گئی اور ایک نظر کمرے میں ڈالی، وڈیرہ حق نواز کے علاوہ

بڑی ماں بھی کمرے میں موجود اون سلائیوں میں الجھی ہوئی تھیں۔ انہیں تو بس اس نے ہمیشہ ان دھاگوں میں ہی الجھا دیکھا تھا۔

سلطان شاہ بھی موجود تھا بڑے صوفے پر بابا سائیں ٹانگ پر ٹانگ جمائے سگار سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ان کے ہاتھ کے اشارے پر وہ ان کے سامنے کرسی پر ٹک گئی۔

کیا کرتی رہتی ہو سارا سارا دن۔

وہ اسے بغور دیکھ رہے تھے جانے کیا تھا ان کی نظروں میں اسے الجھن ہونے لگی۔ بس بابا سائیں کرنا کیا ہے، کبھی یہاں کبھی وہاں پڑی رہتی ہوں۔

بابا ہم نے تمہیں باہر نکلنے کی اجازت ضرور دے رکھی ہے مگر اتنی بھی نہیں، کہ تم جب دل چاہا منہ اٹھائے نکل جاؤ اور کمی ہاریوں کی بیٹی سے دوستیاں گانٹھتی پھر، اپنی اور ان کی حیثیت میں تمہیں فرق نظر نہیں تا بابا یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہے نا۔ ان کی بات سن کر وہ کرسی سے کھڑی ہو گئی۔

بیٹھو ابھی تم سے کچھ اور بھی کہنا ہے۔

بابا سائیں کی بھاری تحکم بھری واز نے اس کا اٹھتا قدم پھر سے روک دیا اس نے بے قراری سے پہلو بدل کر بابا سائیں کو دیکھا اور بولی۔

یہ ساری باتیں خوشیوں کے حصول میں رکاوٹ بنتی ہیں، بابا سائیں بلقیس اچھی لڑکی ہے میرے لئے یہی کافی ہے۔

خیر، میں بار بار باتیں دہرانے کا عادی نہیں ہوں، جو چیز جہاں اچھی لگتی ہے اسے وہیں ہونا چاہئے۔

کیا چیزوں اور انسانوں میں فرق نہیں ہے بابا سائیں۔

اس نے رسان سے کہا تو ایک لمحے کو وڈیرہ حق نواز نے چونک کر اسے دیکھا، ان کے چہرے کے نقوش میں کرختگی در ئی۔

سلطان شاہ بھی اخبار سے نظر ہٹا کر اس کے اعتماد کو نظر انداز نہ کر سکا جبکہ بڑی ماں، اسے دیکھ کر ایک دبی دبی سانس لے کر رہ گئیں۔

اس کا مطلب ہے ہم نے تمہیں ضرورت سے زیادہ زادی دے دی ہے جس کا نتیجہ ج ہمارے سامنے ہے، مہران شاہ کے ساتھ بھی تمہاری بدتمیزی میرے علم میں ئی ہے۔

بابا سائیں صوفہ چھوڑ کر کھڑے ہو گئے تھے وہ دو قدم پیچھے ہٹ کر حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔

(گویا ادا مہران شاہ نے ہی بابا سائین کے کان بھرے ہیں۔)

معافی چاہتی ہوں بابا سائیں، میں نے ادا کے ساتھ کوئی بدتمیزی نہیں کی بس جو دیکھا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔

بآ۔۔۔۔۔س۔ بابا سائیں کی گرجدار واز کمرے کی فضا کو مرتعش کر گئی وہ بھی ایک لمحہ کو سہم گئی، نکھوں کی زمین بے اختیار نم ہو گئی۔

فاطمہ۔انہوں نے یکدم بڑی ماں کو مخاطب کیا ان کا چہرہ خطرناک حد تک سرخ ہو رہا تھا گویا اس چھوٹی سی لڑکی نے انہیں گرما کر رکھ دیا تھا۔

تمہیں ایک تو ان دھاگوں سے ہی فرصت نہیں ملتی۔

ان کے غصے کا رخ اماں کی طرف ہو چکا تھا۔انہوں نے اس کے ہاتھ سے لے کر دھاگوں کا گچھا لے کر فرش پر پھینک دیا۔

تم ولایت کے یہاں فون کر کے بھابھی سے بات کرو کہ وہ ج گر زیمل کو دوپٹہ پہنا جائیں۔

بڑی ماں کا دل سینے کی دیوار میں لرز کر رہ گیا۔

۔۔۔ پ نے تو کہا تھا رئیس کہ۔۔۔۔۔۔ پ شہر جا رہے ہیں، بھابھی کو میں نے ابھی روک دیا تھا۔

نہیں ابھی شہر نہیں جا رہا میں کچھ کام یہاں ہیں جو نمٹانے ہیں مگر لگتا ہے سب سے ضروری کام یہی ہے۔۔۔۔۔۔اس چھوری (لڑکی) کی شادی۔وہ چادر کا کونا کندھے پر ڈال کر بڑے بڑے قدم اٹھاتے کمرے سے نکل گئے۔

اماں نے لرزتے ہاتھوں سے سلائیاں سائڈ میز پر رکھیں اور زرد پڑتی زیمل کی طرف دیکھا۔دوسرے ہی لمحے وہ گھبرا کر اپنی جگہ سے اٹھیں۔

زیمل چکرا کر فرش پر گرنے لگی تھی کہ سلطان شاہ نے سرعت سے گے بڑھ کر اسے تھام

# در امید کے دریوزہ گر

از

سمیہ مرزا